قرآن اور سائنس

مرتب
غلام ربانی فدآ

نام کتاب : ''قرآن اور سائنس''

مرتب : غلام ربانی فدؔا

بشکریہ : طارق اقبال سوہدروی جدہ۔سعودی عرب

:

سنِ اشاعت : مارچ2014ء

تعداد : ۱۰۰۰ بارِاول

قیمت : ۱۰۰روپۓ

کمپوزنگ : عالمہ سیدہ نورفاطمہ ربانی اشرفی

ناشر : آل انڈیا تحریک فکرنعت

معرفت نوراحمد اکّی ، ہیرور تعلقہ ہانگل ضلع ہاویری-581104

ملنے کے پتے:

۲) حافظ محمد صادق رضا اشرفی بلاری مسجد، لکشمیشور ضلع گدگ

۳) فردوس کتاب گھر رسول پور دھارواڑ

۴) مدنی بک اسٹال قادریہ مسجد بنکاپور چوک ہبلی

GULAM RABBANI FIDA, C/o N.K Akki, Post: HIRUR,
Tq: Hangal, Dist: Haveri-581104(karnatak)
www.gulamrabbanifida.blogspot.in.
ww.jahanenaat.blogspot.in
Email: gulamrabbanifida@gmail.com, mbl:09741277047

دھنک

انتساب

امیر القلم والتحریر، آبروئے مذہبی صحافت

حضرت مولانا خوشتر نورانی

(مدیر اعلیٰ ماہنامہ جام نور دہلی)

کے نام

ہدیۂ تبریک

ممتاز محقق و ناقد شہید بغداد

حضرت سید اسید الحق عاصم قادری رضی اللہ عنہ

کی بارگاہ اقدس میں پیش کرتے ہیں،

یادرفتگاں کی ہمت بھی نہ رہی
یاروں نے بسالی اتنی دور بستیاں

ابتدائیہ

اسلامی علوم بالخصوص قرآن وسنت کے حوالے سے تحقیق،تفسیر،تشریح،تسہیل اور تفہیم کا کام صدیوں پر محیط ایک مستحکم اور درخشندہ تاریخ کا حامل ہے۔اس ضمن میں محققین،مفسرین اور متکلمین نے جس عرق ریزی اور جاں فشانی کا مظاہرہ کیا،اس کے نتیجے میں دنیا کا بہترین دینی ادب منصۂ شہود پر آیا۔صدہا سال پر محیط مسلمانوں کے علمی عروج کے زوال کا آغاز 1258ء میں سقوطِ بغداد سے ہوا،جو 1924ء میں سقوطِ خلافت عثمانیہ پر تمام ہوا۔دوسری جانب یورپ اس دوران نشاۃ ثانیہ کے عمل سے گزر رہا تھا۔جہاں سائنسی علوم کے ساتھ ہر شعبہ زندگی میں بیداری کی لہر جاری تھی،سترہویں صدی میں برق وبھاپ کی قوتوں کے بعد اس لہر میں مزید تیزی آئی،جب کہ مارٹن لوتھر کی ''تحریک اِصلاح مذہب'' اور پاپائیت کے خلاف علم بغاوت نے مذہب (عیسائیت) کو سائنس کے مقابل سوالیہ نشان بنا دیا۔اس تحریک سے متاثر،بعض غیر مسلموں اور مغربی تہذیب وترقی سے مرعوب مسلمانوں نے خود اسلام کو بھی سائنسی معیار پر پرکھنے کی کوشش کی۔وہ اس بات کے قائل نظر آتے تھے کہ ''اسلام اور سائنس کا ارتباط اور اتصال محال ہے''۔

ہر عہد کا اپنا ایک محاورہ اور معیار ہوتا ہے جس کے مطابق نظریات کی تفہیم وتجزیہ کیا جاتا ہے،یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے آغاز سے ہی ''سائنس'' اپنے عہد کا محاورہ قرار پائی تھی اور گزرنے والے مہ و سال اس کے محکم ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر رہے تھے،ایسے میں درپیش صورت حال کا مسکت جواب دینے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

''موجودہ دور میں اسلام کے علم الکلام کی بنیاد بھی جدید تجرباتی علوم کی دریافتوں پر استوار ہونی چاہیے،اس لیے کہ ان کے نتائج قرآنی افشائے حقیقت سے ہم آہنگ ہیں،چناں چہ دین کا سائنٹیفک علم موجودہ دور کے مسلمانوں کے اعتقاد کو پختہ اور راسخ بنا دے گا۔'' (علامہ محمد اقبال/ دیباچہ: فکر اسلامی کی تشکیل نو)

اس پس منظر میں ''اسلام اور سائنس'' کے باہمی ربط کی بنیادوں کی تلاش کا آغاز ہوا۔اس باب میں ایک نمایاں نام مصر سے تعلق رکھنے والے ''علامہ طنطاوی جوہری'' کا ہے،جنہوں نے ''جواہر القرآن'' کے نام سے ایک مفصل تفسیر قرآن مرتب کی،جس میں اپنے عہد تک کی سائنسی

ایجادات وترقی کو قرآن کی روشنی میں پرکھا اور کوشش کی کہ یہ دکھائیں کہ قرآن میں جتنے سائنسی بیانات آئے ہیں ان کی اب تک کے سائنسی تجربے اور تحقیق نے تائید کی ہے۔

ہندوستان میں اسلام اور سائنس کے حوالے مسلک حقہ اہل سنت والجماعت مجدد آقائے نعمت اعلیٰ حضرت مولانا امام احمد رضا خان علیہ الرحمہ نے تحقیق کی اور موجودہ دور میں غیر مقلد وہابی اسکالر ڈاکٹر ذاکرنائک نے بھی اپنے طور پہ سعی کی۔اس سلسلے میں ہم مجلات میں ماہنامہ جام نور دہلی کے مدیر مولانا خوشتر نورانی اور ان کی ٹیم کو فراموش نہیں کرسکتے۔جنہوں نے ہمیشہ مثبت فکر رائج کرنے کی کوشش کی۔

پاکستان میں اس موضوع پر کام کرنے والوں میں ایک معتبر نام ''ڈاکٹر خالد غزنوی'' کا ہے، جنہوں نے ''طب نبوی اور جدید سائنس'' کے عنوان کے تحت احادیث میں وارد مختلف پھلوں، سبزیوں اور دیگر اشیاء کے خواص پر بحث کی ہے اور انہیں مختلف امراض میں نافع قرار دیا ہے۔ پاکستان سے تعلق رکھنے والے افراد میں آغا اشرف (معراج اور سائنس)، ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری (سائنسی انکشافات قرآن وحدیث کی روشنی میں) اور پروفیسر ڈاکٹر دلدار احمد قادری (قرآن کے سائنسی معجزے) کی کوششیں قابل تحسین ہیں۔(یہ صرف چند نام ہیں ورنہ یہ موضوع اپنی کیفیت وکمیت کے اعتبار سے خود تحقیق کا متقاضی ہے)

''اسلام اور سائنس'' پر صرف اسلامی دنیا میں ہی کام نہیں ہوا، بلکہ اسلام کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوششیں یورپ میں بھی جاری ہیں۔اس بارے میں سب سے نمایاں نام فرانس سے تعلق رکھنے والے سائنس دان اور ماہر امراض قلب ڈاکٹر موریس بوکائیے (پیدائش 19 جولائی 1920۔وفات 17 فروری 1998) کا ہے، جن کی تحقیقی کاوش بصیرت افروز بھی ہے اور ایمان افروز بھی۔ڈاکٹر موریس بکائیے فرانس کی میڈیکل ایسوسی ایشن کے صدر اور سعودی شاہ فیصل بن عبدالعزیز کے ذاتی معالج تھے۔ایک روز جب وہ اپنی پیشہ ورانہ خدمت کی انجام دہی کے لیے ریاض (سعودی عرب) کے ایک ہوٹل میں مقیم تھے کہ انہیں قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ پڑھنے کا اتفاق ہوا، ڈاکٹر موریس بکائیے نے اس ترجمے کا کئی بار بالاستیعاب مطالعہ کیا اور اس میں موجود بعض ایسے بیانات جو سائنسی نوعیت کے تھے، مثلاً ارض وسماء کی تخلیق اور انسانی پیدائش وغیرہ، کو نہایت دل چسپی سے پڑھا اور انہیں نشان زد کرتے گئے۔ریاض سے پیرس واپسی پر انہیں اسی تناظر میں بائبل کو

پڑھنے کا خیال آیا، یوں انہوں نے بائبل کے ایسے نکات یکجا کر لیے جو سائنسی انکشافات پر مبنی تھے، بعد ازاں انہوں نے بائبل اور قرآن کے ان بیانات کو جب سائنسی معیار پر پرکھا تو جو حقیقت سامنے آئی وہ نہایت حیران کن تھی، یعنی بائبل کے سائنسی انکشافات سو فی صد غلط اور قرآن کے سائنسی انکشافات سو فی صد درست ثابت ہوئے۔ ڈاکٹر موریس بکائیے کی یہ کاوش اول اول فرانسیسی زبان میں "La bible, le coranet la science" کے عنوان سے سامنے آئی، جسے دنیا بھر میں پزیرائی حاصل ہوئی اور متعدد زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے۔ اردو میں یہ کتاب ''بائبل، قرآن اور سائنس'' کے نام سے عام دستیاب ہے۔ قرآنی انکشافات کے سائنسی اثبات نے ڈاکٹر موریس بکائیے کے شوق جستجو کے لیے مہمیز کا کام کیا، چنانچہ اس بار انہوں نے ''صحیح بخاری'' کا انتخاب کیا، جو اپنی اسناد کی پختگی کی وجہ سے ''بعد از قرآن اصح الکتاب'' کہلاتی ہے۔ ڈاکٹر موریس بکائیے نے ''صحیح بخاری'' کی ایسی سو روایات کا انتخاب کیا، جن سے کسی نہ کسی طور سائنسی پہلو نکلتا تھا۔ بعد ازاں ان روایات کو سائنسی معیارات پر جانچ کر اسے ایک مقالے کی صورت دی اور اشاعت سے قبل اسے مطالعے کے لیے پیرس ہی میں مقیم بین الاقوامی شہرت یافتہ محقق، سیرت نگار اور اسلام کے بین الاقوامی قانون پر اتھارٹی کا درجہ رکھنے والے عالم باعمل ڈاکٹر محمد حمید اللہ (پیدائش فروری 1908ء، انتقال 17 دسمبر 2002ء) کی خدمت میں پیش کیا۔

ڈاکٹر حمید اللہ کے مطابق موریس بکائیے نے صحیح بخاری کی منتخب سو روایات میں سے اٹھانوے روایات میں بیان کردہ سائنسی حقائق کو حرف بہ حرف درست قرار دیا۔ تاہم مندرجہ ذیل دو روایت پر انہیں اعتراض تھا کہ یہ سائنسی بنیادوں پر تسلیم نہیں کی جا سکتیں۔ اول یہ کہ (مفہوم): ''مکھی کے ایک پر میں بیماری اور دوسرے میں شفا ہوتی ہے''۔ ثانیاً (مفہوم) ''قبیلہ عرینہ کے وفد کی مدینے آمد کے بعد ایک مخصوص بیماری میں مبتلا ہونے پر ان کے لیے اونٹ کا پیشاب اور دودھ بطور دوا تجویز کرنا''۔ پہلی روایت پر ڈاکٹر موریس بکائیے کا اعتراض یہ تھا کہ مکھیاں تو بیماری پھیلاتی ہیں۔ ان کے پروں میں شفا ہونا ممکن نہیں، جبکہ دوسری روایت میں اونٹ کے پیشاب کو بطور دوا تسلیم کرنے میں اسے تامل تھا۔

''ڈاکٹر حمید اللہ نے موریس بکائیے سے کہا کہ میں نہ تو سائنس دان ہوں نہ میڈیکل ڈاکٹر ہوں، اس لیے میں آپ کے ان دلائل کے بارے میں سائنسی اعتبار سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن ایک عام آدمی کے طور پر میرے کچھ شبہات ہیں جن کا آپ جواب دیں پھر اس تحقیق کو اپنے اعتراضات کے

ساتھ ضرور شائع کردیں۔ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں نے میٹرک میں سائنس کی ایک دو کتابیں پڑھی تھیں،اس وقت مجھے کسی نے بتایا تھا کہ سائنس دان جب تجربات کرتے ہیں تو اگر ایک تجربہ دو مرتبہ صحیح ثابت ہوجائے تو سائنس دان اسے پچاس فی صد درجہ دیتا ہے اور جب تین چار مرتبہ صحیح ہوجائے تو اس کا درجہ اور بڑھ جاتا ہے اور چار پانچ مرتبہ کے تجربات میں بھی اگر کوئی چیز صحیح ثابت ہوجائے تو آپ کہتے ہیں فلاں بات سو فی صد صحیح ثابت ہوگئی،حالاں کہ آپ نے سو مرتبہ تجربہ نہیں کیا ہوتا۔ڈاکٹر موریس نے کہا کہ ہاں واقعی ایسا ہی ہے۔اگر چار پانچ تجربات کا ایک ہی نتیجہ نکل آئے تو ہم کہتے ہیں کہ سو فی صد یہی نتیجہ ہے۔اس پر ڈاکٹر حمید اللہ نے کہا جب آپ نے صحیح بخاری کے سو بیانات میں سے اٹھانوے تجربات درست قرار دے دیے ہیں تو پھر ان دو نتائج کو بغیر تجربات کے درست کیوں نہیں مان لیتے؟ جب کہ پانچ تجربات کرکے آپ سو فی صد مان لیتے ہیں۔یہ بات تو خود آپ کے معیار کے مطابق غلط ہے۔اس پر ڈاکٹر موریس بکائیے نے اسے تسلیم کیا کہ واقعی ان کا یہ نتیجہ اور یہ اعتراض غلط ہے۔دوسری بات ڈاکٹر حمید اللہ نے یہ کہی کہ میرے علم کے مطابق آپ میڈیکل سائنس کے ماہر ہیں،انسانوں کا علاج کرتے ہیں۔آپ جانوروں کے ماہر تو نہیں ہیں تو آپ کو پتا نہیں کہ دنیا میں کتنے قسم کے جانور پائے جاتے ہیں؟ کیا آپ کو پتا ہے کہ دنیا میں کتنی اقسام کی مکھیاں ہوتی ہیں؟ کیا آپ نے کوئی سروے کیا ہے؟ دنیا میں کس موسم میں کس قسم کی مکھیاں پائی جاتی ہیں؟ جب تک آپ عرب میں ہر موسم میں پائی جانے والی مکھیوں کا تجربہ کرکے اور ان کے ایک ایک جزو کا معائنہ کرکے لیبارٹری میں چالیس پچاس سال لگا کر نہ بتائیں کہ ان میں کسی مکھی کے پر میں کسی بھی قسم کی شفا نہیں ہے،اس وقت تک آپ یہ مفروضہ کیسے قائم کرسکتے ہیں کہ مکھی کے پر میں بیماری یا شفا نہیں ہوتی۔ڈاکٹر موریس بکائیے نے اس سے بھی اتفاق کیا کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔پھر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اگر آپ تحقیق کرکے ثابت کریں کہ مکھی کے پر میں شفا نہیں ہوتی تو یہ کیسے پتا چلے گا کہ چودہ سو سال پہلے ایسی مکھیاں نہیں ہوتی تھیں،ہوسکتا ہے ہوتی ہوں،ممکن ہے ان کی نسل ختم ہوگئی ہو۔جانوروں کی نسلیں تو آتی ہیں اور ختم ہوجاتی ہیں۔روز کا تجربہ ہے کہ جانوروں کی ایک نسل آئی اور بعد میں وہ ختم ہوگئی۔تاریخ میں ذکر ملتا ہے اور خود سائنس دان بتاتے ہیں کہ فلاں جانور اس شکل اور فلاں اُس شکل کا ہوتا تھا۔ڈاکٹر موریس بکائیے نے اسے بھی تسلیم کیا۔ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے کہا کہ میں بہ طور ایک عام آدمی کے یہ سمجھتا ہوں کہ بعض بیماریوں کا علاج تیزاب سے بھی ہوتا ہے۔دواؤں میں کیا ایسڈ شامل نہیں ہوتے؟ جانوروں کے پیشاب میں کیا ایسڈ شامل نہیں

ہوتا؟ ہوسکتا ہے کہ بعض علاج جو آج خالص اور آپ کے بقول پاک ایسڈ سے ہوتا ہے تو اگر عرب میں اس کا رواج ہو کہ نیچرل طریقے سے لیا ہوا کوئی ایسا لیکوڈ جس میں تیزاب کی ایک خاص مقدار پائی جاتی ہو، وہ بطور علاج کے استعمال ہوتا ہو تو اس میں کون سی بات بعید از مکان اور غیر سائنسی ہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آج سے کچھ سال پہلے میں نے ایک کتاب پڑھی تھی۔ ایک انگریز سیاح تھا جو جزیرہ عرب کی سیاحت کر کے گیا تھا۔ اس کا نام ''ڈاؤنی'' تھا۔ اس نے عرب کا دورہ کیا تھا اور دو کتابیں لکھی تھیں، جو بہت زبردست سمجھی جاتی ہیں۔ ایک کا نام Arabia deserta اور دوسری کا نام Arabia Petra ہے۔ یعنی جزیرہ عرب کا صحرائی حصہ اور جزیرہ عرب کا پہاڑی حصہ۔ انہوں نے کہا کہ اس شخص نے اتنی کثرت سے یہاں سفر کیا ہے۔ یہ اپنی یادداشت میں لکھتا ہے کہ جزیرہ عرب کے سفر کے دوران ایک موقع پر میں بیمار پڑ گیا، پیٹ پھول گیا، رنگ زرد پڑ گیا اور مجھے زرد بخار کی طرح ایک بیماری ہوگئی، جس کا میں نے دنیا میں جگہ جگہ علاج کروایا لیکن کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ آخر کار جرمنی میں کسی بڑے ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ جہاں تمہیں یہ بیماری لگی ہے وہاں جاؤ، ممکن ہے کہ وہاں کوئی مقامی طریقہ علاج ہو یا کوئی عوامی انداز کا کوئی دیسی علاج ہو، کہتے ہیں کہ جب میں واپس آیا تو جس بدو کو میں نے خادم کے طور پر رکھا ہوا تھا اس نے دیکھا تو پوچھا کہ یہ بیماری آپ کو کب سے ہے؟ میں نے بتایا کہ کئی مہینے ہو گئے ہیں اور میں بہت پریشان ہوں، اس نے کہا کہ ابھی میرے ساتھ چلئے، وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر گیا اور ایک ریگستان میں اونٹوں کے باڑے میں لے جا کر کہا، آپ کچھ دن یہاں رہیں اور اونٹ کے دودھ اور پیشاب کے سوا کچھ اور استعمال نہ کریں، چنانچہ ایک ہفتے تک یہ علاج کرنے کے بعد میں بالکل ٹھیک ہوگیا۔ مجھے حیرت ہے۔''

ڈاکٹر حمید اللہ نے موریس بکائیے سے کہا یہ دیکھیے کہ 1925-26ء میں ایک مغربی مصنف کا لکھا ہوا ہے۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ یہ سابق طریقہ علاج ہو۔ موریس بکائیے نے اپنے دونوں اعتراضات واپس لے لیے اور اس مقالے کو انہوں نے اپنے دونوں اعتراضات کے بغیر ہی شائع کر دیا۔'' یقیناً منقولہ واقعہ ایمان افروز بھی ہے اور ایقان افروز بھی۔ ''اسلام اور سائنس'' کے تناظر میں ہونے والا کام جو انفرادی اور ادارہ جاتی سطح پر انجام دیا جا رہا ہے، قابل تحسین ہے، مگر ان سب کے باوجود اہل علم کا محتاط طبقہ اسلام کی حقانیت کے اثبات میں سائنسی بنیادوں کو بودا، بلکہ خطرناک قرار دیتا ہے، اس طبقے کے مطابق سائنسی انکشافات کو دوام نہیں ہے، یہ کچھ عرصے میں بدل جاتے ہیں۔ ایسے

میں اسلام کی حقانیت کے لیے سائنس کمزور سہارا ہے۔ پھر یہ کہ اسلام سائنس سے بالاتر ایک الہامی دین ہے۔فروغ علم کے باب میں سائنسی ترقی خود اسلام کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے مترادف ہے، کیوں کہ علم کا حصول اور اس کا فروغ، اسلامی تعلیمات کا ہی حصہ ہے، ایسے میں مذہب کو سائنس کے تناظر میں پرکھنا درست نہیں ہے۔

☆☆☆

دین اور سائنس کو الگ الگ کرنا یہ ہم جیسی بیہودہ قوموں کا ہی کام ہے، ورنہ قرآن میں تو جگہ جگہ اشارے درج ہیں، مگر عقل والوں کے لیئے فہم والوں کے لیئے، وظیفے اور چلے چالوں والوں کے لیے نہیں۔ایک اور بات کے سائنس ایجاد نہیں ڈسکور کرتی ہے، ڈسکور کرنے کا مطلب یہ ہے کے چیز کائنات میں موجود رکھی ہے اللہ تعالیٰ نے اور اسے ڈھونڈنے اور تلاش کرنے کا کام انسان کو سونپا ہے اسلئے ہی قرآن میں سات سو پچاس سے بھی زیادہ آیات کا تعلق تفکر تدبر تسخیر کائنات سے ہے، مگر یہ سب رحمتیں اللہ بند ذہن رکھنے والے جاہلوں پر نازل نہیں کرتا، یہ رحمتیں ان پر ہی نازل ہوتی ہیں جو اشرف المخلوقات ہونے کا حق ادا کرنا جانتے ہیں۔مثال کے طور پر اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے ایسی کوئی بیماری نہیں اتاری جس کا علاج نہ رکھا ہو، علاج ڈھونڈنے کا کام اللہ نے انسان کو دیا ہے، مگر یہاں کچھ علما کی قسم کے لوگ دماغ کے استعمال کو تو کفر قرار دیتے ہیں سوال کرنے والے کو کجھ بختیا کہتے ہیں۔کیا قرآن میں تلاش کرنے اور غور وفکر کرنے کا فرمان اللہ نے صرف کفار کے لیے ہی دیا ہے؟

جہاں تک بات فرقہ پرستی کی ہے تو وہ یقینا قابل مذمت ہے۔ہر دن ایک نیا فرقہ نئی بیماری کی طرح جنم لیتا ہے۔ہاں ایک بات اور اسلام میں فی زمانہ جو فرقے ہیں انھیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے جبکہ عیسائیت میں یہ تعداد آج بھی سینکڑوں میں ہے، پھر اسلام کے تمام فرقے اپنے تمام تر اختلاف کے باوجود قرآن کو ہی کتاب ہدایت تسلیم کرتے ہیں، جبکہ عیسائیوں میں یہ تعداد 72 اناجیل سے کم ہو کر آج بھی 5 ہے۔خیر اس پر اور بھی بات ہوسکتی ہے فی الحال اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

ہر لمحہ بدلتی اور ہر نئے نتیجہ کو حتمی قرار دینے والی سائینس کی یہ اوقات نہیں کہ وہ ایمانیات کو اپنے بدلتے پیمانوں اور نتائج کے مطابق پرکھے۔حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے لوگوں کو کھجوروں کی زراعت کے بارے میں بتایا وہ کافی ہے کہ آپ دنیاوی معاملات کے مادی اور عارضی افادی پہلو کو درست کرنے کے لئے مبعوث نہیں ہوئے بلکہ ابدی اور اصلی فلاح کے لئے ہادی اور رہنما

ہیں ۔سائینسی علوم کی تحدیدات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے ۔اس کے تجربات و نتائج پر اپنی عاقبت کا رسک نہیں لیا جا سکتا۔

سائنس اور عقلیت کے اپنے مسائل ہیں۔ یہ ہمارے اصل امراض کا علاج نہیں۔ بقول اقبال

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں — ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
عقل گو آستاں سے دور نہیں — اس کی تقدیر میں حضور نہیں

درحقیقت آج کے اس سائنسی اور مشینی دور میں دعوت کے اس انداز کی اشد ضرورت ہے تاکہ دلائل کی زبان سمجھنے والوں کو قائل کیا جاسکے ۔موجودہ دور میں جدید سائنس نے ہمیں یہ موقع فراہم کیا ہے کہ ہم عام طرزِ دعوت کے ساتھ جدید طرز دعوت کو بھی اپنائیں اور اسے منظم انداز سے دنیا کے سامنے پیش کریں ۔اس بات کا اعتراف کیے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ دعوت کی یہ طرز انتہائی کٹھن اور مشکل ہے اور ہمیں اپنے قدم احتیاط کے ساتھ اٹھانا ہوں گے۔

ہمیں سائنس کو بطور کسوٹی قرآن مجید کو سچا ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کیونکہ قرآن سائنس کی دلیلوں کا محتاج نہیں بلکہ سائنسی نظریات کی حقانیت یا ابطال کو پرکھنے کے لیے قرآن کریم سے رجوع کرنا نہایت ضروری ہے ۔سائنسی نظریات انسان کی جانب سے کی جانے والی مادی تحقیق پر مبنی ہیں جن کا کسی ممکنہ نقص سے پاک ہونے کا یقین نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ جن میں سائنسی بنیادوں پر پیش کیے جانے والے نظریات کو سائنس نے ہی باطل قرار دے دیا ہے ۔اس میں کوئی دورائے نہیں کہ مسلمان کے لیے کسی چیز کے صحیح یا غلط ہونے اور پرکھنے کے لیے اصل کسوٹی ”قرآن مجید“ ہی ہے، سائنس نہیں۔ چنانچہ ہمیں صرف انہی سائنسی دریافتوں کا ذکر کرنا چاہیے جو واقعی دلائل اور ثبوت رکھتی ہیں، جبکہ سائنسی مفروضوں کے ذکر سے اجتناب کیا جائے۔

(قرآن مجید میں بیان کردہ سائنسی علم کے متعلق آیات کے ترجمہ اور تشریح کے لیے سائنس دانوں کی معاونت حاصل کی جائے۔

میں نے یہ کتاب ان مسلمانوں کے لیے مرتب کی ہے جو قرآن مجید کو اپنا ضابطہ حیات قرار دیتے ہیں تاکہ ان کا ایمان مزید پختہ ہو جائے کہ سائنس نے جن حقیقتوں کو آج دریافت کیا ہے ان میں سے کئی ایک کا ذکر قرآن مجید میں کسی نہ کسی شکل میں پہلے سے ہی موجود ہے۔

دوم، اس کی تالیف ان غیر مسلمانوں کے لیے کی ہے جو سائنس پر یقین رکھتے ہیں اور جن کے نزدیک کسی بھی چیز کو پرکھنے کے لیے اصل کسوٹی سائنس ہی ہے تاکہ ان کے لیے حق جاننا، سمجھنا اور پرکھنا

آسان ہو جائے کیونکہ انہی کی مبینہ کسوٹی کو استعمال کرتے ہوئے یہ ثابت کیا جائے گا کہ قرآن مجید برحق اور سچا ہے جبکہ اس کی ضرورت مسلمانوں کو نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے مجھے توفیق بخشی کہ میں اس کار خیر میں شامل ہو سکوں اور اُردو دان طبقے کی دینی خدمت میں حتی المقدور اپنا کردار ادا کر سکوں۔ اس موضوع کے متعلق انگریزی زبان میں تو کافی کتابیں موجود ہیں۔ انٹرنیٹ پر بھی کافی مواد پایا جاتا ہے مگر اردو زبان میں اس کی قلت ہے۔ میں نے اس غرض کے لیے اپنے محدود وسائل سے مختلف تفاسیر اور کتب جمع کیں۔ انٹرنیٹ کا بھی سہارا لیا۔ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر جب کام کا آغاز کیا تو معلوم ہوا کہ یہ انتہائی مشکل کام ہے۔ قرآن مجید میں پیش کیے گئے حقائق کا جدید سائنس سے موازنہ کرنا انتہائی پیچیدہ اور مشکل کام تھا۔ ہر قدم پھونک کر رکھنے کے باوجود یقیناً اس میں کافی خامیاں رہ گئی ہوں گی جن کے لیے میں پیشگی معذرت خواہ ہوں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ غلطیاں نوٹ فرما کر مجھے ضرور مطلع کریں۔

قارئین کی آسانی کے لیے عرض ہے کہ درج ذیل باتوں کو نوٹ کر لیں تا کہ کتاب پڑھنے کے دوران کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

1) آیات کا ترجمہ زیادہ تر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان کا ترجمۂ قرآن ''کنزالایمان'' سے لیا گیا ہے۔ کہیں کہیں تفسیر ابن کثیر کے مترجم جناب مولانا محمد جونا گڑھی کے ترجمہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

2) سائنسی اعداد و شمار مختلف کتابوں میں ایک جیسے نہیں لکھے گئے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ موجودہ دور کے صحیح اعداد و شمار نقل کروں، چنانچہ ہو سکتا ہے کہ حوالہ جاتی کتابوں اور میرے نقل کیے گئے اعداد و شمار میں اختلاف ہوں۔

میں محترم خواجہ فراز بندہ نوز ریسرچ اسکالر اور حافظ قاری محمد صادق اشرفی اور مولانا رحمت اللہ مالدار (سنکیشور)، مولانا عمران رضا گوکاک (سنکیشور) اور مولانا محمد صادق مقبولی مصباحی صاحبان کا انتہائی مشکور ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کا بغور مطالعہ کیا، اس کی تدوین و تالیف میں میری مدد کی اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ میری شریک حیات عالمہ سیدہ نور فاطمہ فدائی اشرفیکا بھی بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے بھرپور معاونت کرتے ہوئے میری حوصلہ افزائی کی۔ طارق اقبال سوہدروی (جدہ سعودی عرب) کا بھی شکر گزار ہوں کہ آپ نے کافی مواد عنایت کیا اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میری اس حقیر سی کوشش کو قبولیت کا درجہ عطا فرمائے اور اس کو میرے لیے سامانِ آخرت بنائے۔ آمین!

کیا اسلام اور سائنس میں تضاد ہے

سائنس لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی جاننا کے ہیں۔ پروفیسر کے لنگسرد کے مطابق سائنس نظام فطرت کے علم کا نام ہے جو مشاہدہ، تجربہ اور عقل سے حاصل ہوتا ہے۔علم کے جس شعبے کو ہم سائنس کہتے ہیں اس کا دوسرا نام علم کائنات ہے جس میں انسان کا علم بھی شامل ہے۔سائنس دان کائنات کے مشاہدے سے کچھ نتائج اخذ کرتا ہے۔ ہر درست سائنسی نتیجے کو ہم مستقل علمی حقیقت یا قانون قدرت سمجھتے ہیں۔مشاہدے اور تجربے سے دریافت ہونے والے علمی حقائق کو جب مرتب اور منظم کرلیا جاتا ہے تو اسے ہم سائنس کہتے ہیں۔(1)

قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ آسمانوں، زمین، پہاڑوں، ستاروں، پودوں، بیجوں، جانوروں، رات اور دن کے ادل بدل تخلیق انسانی، بارشوں اور بہت سی دیگر مخلوقات پر غور وفکر اور تحقیق کریں تاکہ وہ اپنے گردوپیش میں پھیلے ہوئے کمال ہنرمندی کے گوناگوں نمونے دیکھ کر اس احسن الخالقین کو پہچان سکیں جو اس ساری کائنات اور اس کے اندر موجود تمام اشیاء کو عدم سے وجود میں لایا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ کَاَیِّنۡ مِّنۡ اٰیَۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ یَمُرُّوۡنَ عَلَیۡہَا وَ ہُمۡ عَنۡہَا مُعۡرِضُوۡنَ

اور کتنی نشانیاں ہیں آسمانوں اور زمین میں کہ اکثر لوگ ان پر گزرتے ہیں (ف ۲۳۰) اور ان سے بے خبر رہتے ہیں۔(2)

نیز فرمایا:

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ وَ الۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا وَ بَثَّ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّۃٍ ص وَّ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ

بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات و دن کا بدلتے آنا اور کشتی کہ دریا میں لوگوں

کے فائدے لے کر چلتی ہے اور وہ جو اللہ نے آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو اس سے جِلادیا اور زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلائے اور ہواؤں کی گردش اور وہ بادل کہ آسمان و زمین کے بیچ میں حکم کا باندھا ہے ان سب میں عقلمندوں کے لئے ضرور نشانیاں ہیں ۔(3)

ایک جگہ فرمایا:

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ

بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش آدمیوں کی پیدائش سے بہت بڑی لیکن بہت لوگ نہیں جانتے (4)

امام ابن کثیر ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

بنی اسرائیل کے عابدوں میں سے ایک نے اپنی تیس سال کی مدتِ عبادت پوری کر لی تھی مگر جس طرح اور عابدوں پر تیس سال کی عبادت کے بعد ابر کا سایہ ہو جایا کرتا تھا اس پر نہ ہوا تو اس نے اپنی والدہ سے یہ حال بیان کیا۔ اس نے کہا بیٹے تم نے اپنی اس عبادت کے زمانہ میں کوئی گناہ کر لیا ہوگا، اس نے کہا اماں ایک بھی نہیں ۔کہا پھر کسی گناہ کا پورا قصد کیا ہوگا۔ جواب دیا کہ ایسا بھی مطلقاً نہیں ہوا۔ ماں نے کہا بہت ممکن ہے کہ تم نے آسمان کی طرف نظر کی ہو اور غور و تدبر کے بغیر ہی ہٹا لی ہو۔ عابد نے کہا کہ ایسا تو برابر ہوتا رہا۔ فرمایا بس یہی سبب ہے ۔(5)

اللہ کے رسول ﷺ نے بھی لوگوں کو علم حاصل کرنے کا حکم دیا اور بڑی تاکید سے فرمایا کہ علم کا حصول ہمارے فرائض میں شامل ہے ۔آپ ﷺ کا فرمان مبارک ہے ۔

علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے ۔(6) نیز علم حاصل کرو اور دوسروں کو سکھاؤ ۔(7)

قرآن مجید میں ایک مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا

االلہ سے اس کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں (فاطر: 28

یہاں ایک اہم واقعہ کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جس کے راوی علامہ عنایت اللہ مشرقی ہیں ۔ یہ واقعہ ان کے ساتھ اس وقت پیش آیا جب وہ برطانیہ میں زیر تعلیم تھے ۔

1909ء کا ذکر ہے، اتوار کا دن تھا اور زور کی بارش ہو رہی تھی ۔ میں کسی کام سے باہر نکلا تو

جامعہ کیمبرج کے مشہور ماہر فلکیات سر جیمز جینس (James Jeans) بغل میں انجیل دبائے چرچ کی طرف جارہے تھے۔ میں نے قریب ہو کر سلام کیا تو وہ متوجہ ہوئے اور کہنے لگے: کیا چاہتے ہو؟ میں نے کہا دو باتیں، اوّل یہ کہ زور سے بارش ہو رہی ہے اور آپ نے چھاتہ بغل میں داب رکھا ہے۔ سر جیمز اپنی بدحواسی پر مسکرائے اور چھاتہ تان لیا۔ دوم یہ کہ آپ جیسا شہرہ آفاق آدمی گرجا میں عبادت کے لیے جارہا ہے؟ میرے اس سوال پر جیمز لمحہ بھر کے لیے رک گئے اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا، آج شام میرے ساتھ چائے پیو!

چنانچہ میں شام کو ان کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ ٹھیک چار بجے لیڈی جیمز نے باہر آ کر کہا: سر جیمز تمہارے منتظر ہیں۔ اندر گیا تو ایک چھوٹی سی میز پر چائے لگی ہوئی تھی، پروفیسر صاحب تصوّرات مین کھوئے ہوئے تھے۔ کہنے لگے، تمہارا سوال کیا تھا؟ اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اجرام آسمانی کی تخلیق، ان کے حیرت انگیز نظام، بے انتہا پہنائیوں اور فاصلوں، ان کی پیچیدہ راہوں اور مداروں نیز باہمی روابط اور طوفان ہائے نور پر وہ ایمان افروز تفصیلات پیش کیں کہ میرا دل اللہ کی اس کبریائی وجبروت پر دہلنے لگا اور ان کی اپنی کیفیت تھی کہ سر بال سیدھے اُٹھے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے حیرت وخشیت کی دوگونہ کیفیتیں عیاں تھیں، اللہ کی حکمت و دانش کی ہیبت سے ان کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے اور آواز لرز رہی تھی۔ فرمانے لگے، عنائت اللہ خاں، جب میں اللہ کے تخلیقی کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو میری تمام ہستی اللہ کے جلال سے لرزنے لگتی ہے اور جب میں کلیسا میں اللہ کے سامنے سرنگوں ہو کر کہتا ہوں تو بہت بڑا ہے تو میری ہستی کا ہر ذرہ میرا ہمنوا بن جاتا ہے، مجھے بے حد سکون... اور خوشی نصیب ہوتی ہے۔ مجھے دوسروں کی نسبت عبادت میں ہزار گنا زیادہ کیف ملتا ہے، کہو عنائت اللہ خاں! تمہاری سمجھ میں آیا کہ میں کیوں گرجے جاتا ہوں؟

علامہ مشرقی کہتے ہیں کہ پروفیسر جیمز کی اس تقریر نے میرے دماغ میں عجیب کہرام پیدا کر دیا۔ میں نے کہا جناب والا! میں آپ کی روح پرور تفصیلات سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید کی ایک آیت یاد آ گئی ہے، اگر اجازت ہو تو پیش کروں؟ فرمایا" ضرور! چنانچہ میں نے یہ آیت پڑھی:

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَٰلِكَ ط إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ

اور پہاڑوں میں راستے ہیں سفید اور سرخ رنگ رنگ کے اور کچھ کالے بھوچنگ اور آدمیوں اور جانوروں اور چوپایوں کے رنگ یونہی طرح طرح کے ہیں اللہ سے اس کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں بیشک اللہ بخشنے والا ،عزت والا ہے۔(فاطر:28)

یہ سنتے ہی پروفیسر جیمز بولے:

''کیا کہا؟ اللہ سے صرف اہل علم ڈرتے ہیں؟ حیرت انگیز،بہت عجیب۔یہ بات جو مجھے پچاس برس مسلسل مطالعہ اور مشاہدہ کے بعد معلوم ہوئی''

حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کس نے بتائی؟ کیا قرآن مجید میں واقعی یہ آیت موجود ہے؟ اگر ہے تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اَن پڑھ تھے، انہیں یہ عظیم حقیقت خود بخود معلوم نہ ہوسکتی تھی، یقیناً اللہ تعالیٰ نے انہیں بتائی تھی۔بہت خوب،،بہت عجیب!

(8) چنانچہ سائنس ہمیں اس کائنات اور دیگر موجودات کے مطالعے کا ایک طریقہ بتاتی ہے۔اس سے ہمیں مخلوق کے وجود کی رعنائیوں اور خالق کی حکمت بالغہ کا شعور ملتا ہے۔لہٰذا اسلام سائنس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کیونکہ ہم اس کے ذریعے تخلیقاتِ خداوندی کی لطافتوں اور نزاکتوں کا بہتر مطالعہ کر سکتے ہیں۔

اسلام مطالعہ اور سائنس کی نہ صرف حوصلہ افزائی کرتا ہے بلکہ اس امر کی بھی اجازت دیتا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو اپنے تحقیقی کام کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے دین کے بیان کردہ حقائق سے بھی مدد لے سکتے ہیں۔اس سے ٹھوس نتائج برآمد ہونے کے ساتھ ساتھ منزل بھی جلد قریب آجائے گی۔اس کا سبب یہ ہے کہ دین وہ واحد ذریعہ ہے جو زندگی اور کائنات کے ظہور میں آنے سے متعلق سوالات کا صحیح اور متعین جواب فراہم کرتا ہے۔اگر تحقیق صحیح بنیادوں پر استوار ہو تو وہ کائنات کی ابتداء، مقصد زندگی اور نظام زندگی کے بارے میں مختصر ترین وقت میں کم سے کم قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے بڑے حقائق تک پہنچا دے گی۔

آج سائنسی علم نے جو ترقی کی ہے اس نے انسان پر حیرت کے دروازے کھول دیے ہیں، جس چیز کے متعلق آج سے 50 یا 100 سال پہلے سوچنا بھی محال تھا وہ ممکن ہو چکی ہے۔انسان زندگی کے ہر شعبہ میں سائنسی علم پر بھروسہ اور اس کو اپنا تا چلا جا رہا ہے مگر سائنس کا ایک نقصان دہ پہلو یہ سامنے آیا ہے کہ بعض مسلمان بھی دین کے معاملے میں سائنس کو بہت زیادہ اہمیت دینے لگے

ہیں ۔وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام اور سائنس میں تضاد ہے ۔دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتے اور یہ کہ اسلام ایک قدیم مذہب ہے جوموجودہ زمانے کی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتا جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے ۔مودودی بھی جدید سائنس کے حوالے سے رقمطراز ہے کہ:

قدیم زمانے میں لوگوں کے لیے آسمان وزمین کے رتق وفتق اور پانی سے ہر زندہ چیز کے پیدا کیے جانے اور تاروں کے ایک ایک فلک میں تیرنے کا مفہوم کچھ اور تھا موجودہ زمانے میں طبیعیات(Physics)،حیاتیات(Biology)،اورعلم ہیئت(Astronomy) کی جدید معلومات نے ہمارے لیے ان کا مفہوم کچھ اور کر دیا ہے اور نہیں کہہ سکتے کہ آگے چل کر انسان کو جو معلومات حاصل ہونی ہیں وہ ان الفاظ کے کن معانی پر روشنی ڈالیں گی ۔(9)

فزکس کے مشہور نوبل انعام یافتہ سائنس دان ''البرٹ آئن سٹائن '' کے بقول سائنس مذہب کے بغیر لنگڑی ہے اور مذہب سائنس کے بغیر اندھا ہے ''(10)۔اس کے معنی یہ ہیں کہ سائنس کو اگر مذہب کی روشنی اور رہنمائی حاصل نہ ہو تو وہ صحیح طور پر آگے کی طرف قدم نہیں بڑھا سکتی ۔ایسا نہ کرنے سے یقینی نتائج کے حصول میں نہ صرف بہت سا وقت ضائع ہوجائے گا بلکہ اس سے بڑھ کر یہ امکان بھی غالب ہے کہ

تحقیق بالکل بے نتیجہ اور ناقص رہے گی اور ماضی گواہ ہے کہ اکثر ایسا ہی ہوتا رہا ہے ۔مادہ پرست سائنس دانوں نے ماضی میں جو طریقہ اختیار کیا بالخصوص پچھلے 200 سال میں، وہ جو مساعی بروئے کار لاتے رہے اس میں بہت سا وقت ضائع ہوا ۔بہت سی تحقیق اکارت گئی اور اس پر صرف ہونے والا لاکھوں کروڑوں ڈالرز کا سرمایہ ضائع ہوگیا۔اس سے انسانیت کو کچھ بھی فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔اس لیے کہ ان کی تحقیق کی بنیاد غلط راستوں پر استوار تھی ۔یہی چیز مذہب اور سائنس کے درمیان ٹکراؤ کا باعث بنی اور اہل مذہب سائنس سے متنفر ہوئے ۔

اس سے یہ بات واضح طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ سائنس صرف اسی صورت میں قابل اعتماد نتائج حاصل کرسکتی ہے جب اس کی تحقیق وتفتیش کا مدعا ومقصد کائنات کے رازوں اور اشاروں کو سمجھنا ہو۔اگر اس نے اپنے وقت اور وسائل کو ضائع ہونے سے بچانا ہے تو اسے صحیح ہدایت کی روشنی میں صحیح راستے کا انتخاب کرنا ہوگا۔

یہ تصور کہ سائنس اور مذہب ایک دوسرے کے مخالف ہیں، یہودیت اور عیسائیت کے زیر اثر مما لک میں بھی اسی طرح پھیلا ہوا ہے جیسا کہ اسلامی دنیا میں ہے،خصوصیت سے سائنسی حلقوں میں

اگر اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی جائے تو طویل مباحث کا ایک سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ مذہب اور سائنس کے مابین تعلق کسی ایک جگہ یا ایک وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہا ہے۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ کسی توحید پرست مذہب میں کوئی ایسی تحریر نہیں ہے جو سائنس کو رد کرتی ہو۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ ماضی میں چرچ کے حکم کے مطابق سائنسی علوم کا حصول اور اس کی جستجو گناہ قرار پائی تھی۔ پادریوں نے عہد نامہ قدیم سے ایسی شہادتیں حاصل کیں جن میں لکھا ہوا تھا کہ وہ ممنوعہ درخت جس سے حضرت آدم نے پھل کھایا تھا وہ شجر علم تھا، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہوا اور اپنی رحمت سے محروم کر دیا۔ سائنسی علوم چرچ کے حکم سے مسترد کر دیے گئے اور ان کا حصول جرم قرار پایا۔ زندہ جلا دیئے جانے کے ڈر سے بہت سے سائنس دان جلاوطنی پر مجبور ہو گئے یہاں تک کہ انہیں توبہ کرنا، اپنے رویہ کو تبدیل کرنا اور معافی کا خواستگار ہونا پڑا۔ مشہور سائنس دان گلیلیو پر اس لیے مقدمہ چلا کہ اس نے اس نظریہ کو مان لیا تھا جو زمین کی گردش کے بارے میں کوپرنیکس نے پیش کیا تھا۔ بائیبل کی ایک غلط تاویل کے نتیجہ میں گلی لیو کو سزا دی گئی۔(11)

مسلمان سائنس دانوں کے کارنامے

یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ اسلام کی انتہائی ترقی کے زمانہ میں جو آٹھویں اور بارہویں صدی عیسوی کے درمیان کا زمانہ ہے یعنی وہ زمانہ جب سائنسی ترقی پر عیسائی دنیا میں پابندیاں عائد تھیں اسلامی جامعات میں مطالعہ اور تحقیقات کا کام بڑے پیمانہ پر جاری تھا۔ یہی وہ جامعات تھیں جنہوں نے عظیم مسلمان سائنس دانوں کو جنم دیا۔ اس دور کے مسلم سائنس دانوں نے فلکیات، ریاضی، علم ہندسہ (جیومیٹری) اور طب وغیرہ کے شعبوں میں قابل قدر کارنامے انجام دیے۔ مسلمانوں نے یورپ میں بھی سائنسی علوم کی منتقلی میں اہم کردار ادا کیا اور اپنے ہاں بھی سائنس دانوں کی معقول تعداد پیدا کی۔ اندلس (سپین) میں سائنسی علوم نے اتنی ترقی کی کہ اس ملک کو سائنسی ترقی اور انقلابی دریافتوں کی کٹھالی کہا جانے لگا بالخصوص میڈیسن کے شعبے میں اس نے بے پناہ شہرت حاصل کر لی۔

مسلمان طبیبوں نے کسی ایک شعبے میں تخصیص (Specialization) پر زور دینے کی بجائے متعدد شعبوں بشمول علم دواسازی علم جراحت، علم امراض چشم، علم امراض نسواں، علم عضویات، علم جراثومیات اور علم حفظان صحت میں مہارت تامہ حاصل کر لی۔ اندلس کے حکیم ابن جلجول (992ء

) کو جڑی بوٹیوں اور طبی ادویہ اور تاریخِ طب پر تصانیف کے باعث عالمی شہرت ملی ۔اس دور کا ایک اور ممتاز طبیب جعفر ابن الجذر (1009ء) جو تیونس کا رہنے والا تھا اس نے خصوصی علاماتِ امراض پر تیس سے زیادہ کتابیں لکھیں ۔عبداللطیف البغدادی (1231ء ۔1162ء) کو علم تشریح الاعضاء (ANATOMY) پر دسترس کی وجہ سے شہرت ملی ۔اس نے انسانی ہڈیوں کے بارے میں مروّجہ کتب میں پائی گئی غلطیوں کی بھی اصلاح کی ۔یہ غلطیاں زیادہ تر جبڑے اور چھاتی کی ہڈیوں کے متعلق تھیں ۔بغدادی کی کتاب ''الافادہ والاعتبار'' 1788ء میں دوبارہ زیور طباعت سے مزین ہوئی اور اس کے لاطینی جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں تراجم کرائے گئے ۔اس کی کتاب ''مقالات فی الحواس'' پانچوں حواس کی کارکردگی کے بارے میں تھی ۔

مسلم ماہرین تشریح الاعضاء نے انسانی کھوپڑی میں موجود ہڈیوں کو بالکل صحیح شمار کیا اور کان میں تین چھوٹی چھوٹی ہڈیوں (میلس ،انکس اور سٹیپز) کی موجودگی کی نشاندہی کی ۔تشریح الاعضا کے شعبے میں تحقیق کرنے والے مسلمان سائنس دانوں میں سے ابن سینا (1037 ۔980ء) کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی جسے مغرب میں ''ایویسینا'' (AVICENNA) کہا جاتا ہے ۔اسے ابتدائی عمر میں ہی ادب ریاضی علم ہندسہ (جیومیٹری) طبیعیات ،فلسفہ اور منطق میں شہرت مل گئی تھی ۔نہ صرف مشرق بلکہ مغرب میں بھی ان علوم میں اس کی شہرت پہنچ گئی تھی ۔اس کی تصنیف ''القانون فی الطب'' کو خصوصی شہرت ملی ۔(اسے مغرب میں کینن ''CANON'' کہا جاتا ہے) ۔یہ عربی میں لکھی گئی تھی ۔12ویں صدی میں اس کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا اور 17ویں صدی تک یورپ کے سکولوں میں بطور نصابی کتاب پڑھائی جاتی رہی ۔یہ امراض اور دواؤں کے بارے میں ایک جامع تصنیف ہے ۔اس کے علاوہ اس نے 100 سے زیادہ کتابیں فلسفے اور نیچرل سائنسز پر لکھیں ۔اس کے علم کا بیشتر حصہ بشمول ''القانون فی الطب ''طبی معلومات پر مشتمل ہے جسے آج بھی ایک مسلمہ حیثیت حاصل ہے ۔

زکریا قزوینی نے دل اور دماغ کے بارے میں ان گمراہ کن نظریات کو غلط ثابت کر دیا جو ارسطو کے زمانے سے مروّج چلے آرہے تھے ۔چنانچہ انہوں نے جسم کے ان دو اہم ترین اعضا کے بارے میں ایسے ٹھوس حقائق بیان کر دیئے جو ان کے بارے میں آج کی معلومات سے نہایت قریب ہیں
زکریا قزوینی حمداللہ المستوفی القزوینی (1350 ۔1281ء) اور ابن النفیس نے جدید

طب کی بنیاد رکھی۔ ان سائنس دانوں نے 13ویں اور 14ویں صدیوں میں دل اور پھیپھڑوں کے درمیان گہرے تعلق کی نشاندہی کر دی تھی۔ وہ یوں کہ شریانیں آکسیجن ملا خون لے جاتی ہیں اور وریدیں بغیر آکسیجن خون کو لے جاتی ہیں اور یہ کہ خون میں آکسیجن کی آمیزش کا عمل پھیپھڑوں کے اندر انجام پاتا ہے اور یہ بھی کہ دل کی طرف واپس آنے والا آکسیجن ملا خون شریان کبیر (AORTA) کے ذریعہ دماغ اور دیگر اعضائے بدن کو پہنچتا ہے۔

علی بن عیسیٰ (م1038ء) نے امراض چشم پر تین جلدوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی جس کی پہلی جلد میں آنکھ کی اندرونی ساخت کی مکمل تشریح اور وضاحت کی گئی ہے۔ ان تینوں جلدوں کا لاطینی اور جرمن زبانوں میں ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ محمد بن زکریا الرازی (925-865) برہان الدین نفیس (م438ء) اسماعیل جرجانی (م136ء) قطب الدین الشیرازی (1310 - 1236ء) منصور ابن محمد اور ابوالقاسم الزہراوی (ALBUCASIS) مسلمان سائنس دانوں میں سے وہ اہم شخصیات ہیں جنہیں طب اور تشریح الاعضا کے علوم میں دسترس کی وجہ سے شہرت ملی۔

مسلم سائنس دانوں نے طب اور تشریح الاعضا کے علاوہ بھی کئی شعبوں میں شاندار کارنامے انجام دیئے۔ مثال کے طور پر البیرونی کو معلوم تھا کہ زمین اپنے محور کے گرد گردش کرتی ہے۔ یہ گلیلیو سے کوئی 600 سال قبل کا زمانہ تھا۔ اسی طرح اس نے نیوٹن سے 700 سال پہلے محور زمین کی پیمائش کر لی تھی۔ علی کوشوع ((ALI KUSHCHU پندرہویں صدی کا پہلا سائنس دان تھا جس نے چاند کا نقشہ بنایا اور چاند کے ایک خطے کو اسی کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ 9ویں صدی کے ریاضی دان ثابت بن قرہ (THEBIT) نے نیوٹن سے کئی صدیاں پہلے احصائے تفرقی (DIFFERENTIAL CALCULUS) ایجاد کر لی تھی۔ بطانی 10ویں صدی کا سائنس دان تھا جو علم مثلثات (TIRGNOMETERY) کو ترقی دینے والا پہلا شخص تھا۔ ابوالوفا محمد البرزجانی نے احصائے تفرقی (حساب کتاب کا ایک خاص طریقہ) میں پہلی بار "مماس و مماس التمام (11) (COTANGENT/TANGENT) اور "خط قاطع و قاطع التمام' (SECANT - COSEANT) (12) متعارف کرائے۔

الخوارزمی نے 9ویں صدی میں الجبرا پر پہلی کتاب لکھی۔ المغربی نے فرانسیسی ریاضی دان پاسکل کے نام سے مشہور مساوات "مثلث پاسکل" اس سے 600 سال پہلے ایجاد کر لی تھی۔ ابن

الہیثم (ALHAZEN) جو 11 ویں صدی میں گزرا ہے علم بصریات کا ماہر تھا۔ راجر بیکن اور کیپلر نے اس کے کام سے بہت استفادہ کیا جب کہ گلی لیو نے اپنی دوربین انہی کے حوالے سے بنائی۔

الکندی (ALKINDUS) نے علاقی طبیعیات اور نظریہ اضافت آئن سٹائن سے 1100 سال پہلے متعارف کرا دیا تھا۔ شمس الدین نے پاسچر سے 400 سال پہلے جراثیم دریافت کر لیے تھے۔ علی ابن العباس نے جو 10 ویں صدی میں گزرا تھا کینسر کی پہلی سرجری کی تھی۔ ابن الجسر نے جذام کے اسباب معلوم کیے اور اس کے علاج کے طریقے بھی دریافت کیے۔ یہاں چند ایک ہی مسلمان سائنس دانوں کا ذکر کیا جا سکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے سائنس کے مختلف شعبوں میں اتنے کارہائے نمایاں انجام دیے کہ انہیں بجا طور پر سائنس کے بانی کہا جا سکتا ہے۔

☆مغرب میں سائنسی انقلاب کا زمانہ

جب ہم مغربی تہذیب پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ جدید سائنس خدا پر ایمان کے ساتھ آئی تھی۔ 17 ویں صدی جسے ہم سائنسی انقلاب کا زمانہ کہتے ہیں اس میں خدا پر ایمان رکھنے والے سائنس دانوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ ان کا اولین مقصد خدا کی پیدا کردہ کائنات اور اس کی فطرت دریافت کرنا تھا۔ مختلف ممالک مثلاً برطانیہ اور فرانس وغیرہ میں قائم سائنسی اداروں نے کائنات کے پوشیدہ اسرار دریافت کر کے اس کے خالق کے قریب تر پہنچنے کے عزم کا اعلان کر رکھا تھا۔ یہ رجحان 18 ویں صدی میں بھی برقرار رہا۔ شاندار سائنسی کارنامے انجام دینے والے بعض سائنس دانوں کو قرب الٰہی کے حصول کے اعلانیہ عزم کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا۔ نیوٹن، کیپلر، کوپرنیکس، بیکن، گلیلیو، پاسکل، بوائل، پالے اور کووئیر اسی قبیل کے سائنس دانوں میں سے تھے۔ ان سائنس دانوں نے ایمان باللہ کے جذبے سے سائنسی تحقیق و جستجو کی، جس کی تحریک انہیں جذبہ ایمانی سے حاصل ہوتی تھی۔

اس کا ثبوت ولیم پالے کی 'فطری علم معرفت کے نام سے 1802ء میں چھپنے والی کتاب تھی جس کا اہتمام" برج واٹر ٹریٹیز ز" نے کیا تھا اس کتاب کا پورا نام (NATURAL COLLECTED THEOLOGY:EVIDENCES OF THE EXISTENCE AND ATTRIBUTES OF THE DEITY, FROM APPEARANCES OF NATURE تھا)۔ اس کتاب کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ بندہ مظاہر فطرت پر غور و فکر کر کے ان کے خالق کو پہچان سکتا ہے۔ پالے نے زندہ اجسام کے اعضاء میں ہم آہنگی کو بہترین انداز میں قلم بند کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ ایک خالق کی موجودگی کا اقرار کیے بغیر اس

طرح کی غیر معمولی ڈیزائننگ کا پایا جانا ناممکن ہے۔ بالفاظ دیگر اعضاء کی یہ غیر معمولی ڈیزائننگ اور ان کے افعال، ایک خالق ومدبر کے وجود کا ناقابل تردید ثبوت پیش کرتے ہیں۔

پالے کے تحقیقی کام کو بطور ماڈل سامنے رکھ کر رائل سوسائٹی آف لندن کے نامزد ارکان کے نام ایک خط لکھا گیا جس میں انہیں ذیل کے موضوعات پر ایک ہزار کتابیں لکھنے اور چھپوانے کا اہتمام کرنے کی ہدایت کی گئی۔ خدا کی قدرت وحکمت اور اس کی صفاتِ خیر جن کا اظہار اس کی تخلیقات سے ہوتا ہے اس پر قابل فہم دلائل وبراہین یکجا کرنا۔ مثلاً خدا کی مخلوقات میں پایا جانے والا تنوع نباتات اور معدنیات کی دنیا زندہ اجسام کا نظامِ ہاضمہ اور پھر اس خوراک کو اپنا جزو بدن بنالینا۔ انسان کے ہاتھ کی ساخت اور اس کی دیگر صلاحیتوں کی وجہ سے تخلیقات خداوندی کے دلائل سامنے لانا۔ اس کے علاوہ آرٹس اور سائنس کے شعبوں میں قدیم اور جدید دریافتوں اور پورے ماڈرن لٹریچر کا ان حوالوں سے جائزہ لینا۔

وجود خداوندی کے نشانات کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنے کی اس دعوت کا بہت سے سائنس دانوں نے جواب دیا۔ اس طرح بڑی گراں قدر تصانیف وجود میں آئیں۔ یہ سلسلۂ مطبوعات، مذہب اور سائنس کے اتصال و ہم آہنگی کی صرف ایک مثال ہے۔ اس سے پہلے اور بعد کے بے شمار سائنسی مطالعات اور تحقیقات کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما تھا کہ خدا کی پیدا کردہ کائنات کو سمجھا جائے اور اس کے ذریعہ اس کے خالق کی لامحدود قوتوں کا ادراک کیا جائے۔

☆مذہب اور سائنس میں تصادم کا دور

سائنس دان برادری کا اس ابتدائی راستے سے انحراف 19ویں صدی کے مغربی کلچر کے مادہ پرستانہ فلسفے کے غلبے کا نتیجہ تھا۔ یہ صورت حال بعض سماجی اور سیاسی عوامل کی وجہ سے پیدا ہوئی جس کا بہت بڑا سبب ڈارون کا نظریۂ ارتقا تھا۔ یہ نظریہ ابتدائی نقطہ نظر کے بالکل منافی تھا اور نئی صورت حال یہ بنی کہ مذہب اور سائنس کے لیے حصول علم کے دو ایسے مآخذ سامنے آ گئے جو ایک دوسرے سے متصادم تھے۔ اس صورت حال کے بارے میں برطانیہ کے تین محققین مائیکل بیجینٹ (MICHAEL BAIGENT)) رچرڈ لی RICHARD LEIGH)) اور ہنری لنکن (HENRY LINCOLN) کا یہ تبصرہ تھا:

ڈارون سے ڈیڑھ صدی پہلے آئزک نیوٹن کے لیے سائنس مذہب سے الگ نہیں تھی۔ بلکہ

اس سے بالکل برعکس یہ مذہب کا ایک پہلوتھی اور بالآخر اس کے تابع تھی لیکن ڈارون کے زمانے کی سائنس نے خود کو مذہب سے نہ صرف الگ کرلیا بلکہ اس کی حریف بن گئی۔اس طرح مذہب اور سائنس کے درمیان ہم آہنگی ختم ہوگئی اور وہ دو مخالف سمتوں میں چلنے لگے جس کی وجہ سے انسانیت مجبور ہوگئی کہ وہ دو میں سے کسی ایک کو منتخب کرے(14)

سائنس کے ثابت کردہ حقائق کو اپنے مدمقابل پاکر مادیت پرست عناصر اپنے مخصوص ہتھکنڈوں پر اتر آئے۔سائنس دان کو اپنے شعبے میں ترقی پانے ایم ڈی یا پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے یا سائنسی مجلے میں اپنے مضامین چھپوانے کے لیے چند شرائط پوری کرنی پڑتی تھیں۔ان میں ایک شرط یہ تھی کہ وہ نظریہ ارتقا کو غیر مشروط طور پر قبول کرتا ہو۔اس لیے بعض سائنس دان ڈارون کے مفروضوں کا پرچم اٹھانے پر مجبور ہوگئے حالانکہ دلی طور پر وہ ان کو مسترد کرتے تھے۔تخلیق خداوندی کی نشانیوں کے انکار پر ان کی طبیعت مائل نہیں تھی۔امریکی مجلہ سائنٹیفک امریکن کے ستمبر1999ء کے شمارے میں ایک مضمون امریکہ کے سائنس دان اور مذہب کے عنوان سے شائع ہوا۔مضمون نگار روڈنی سٹارک(RODNEY STARK)نے جو یونیورسٹی آف واشنگٹن میں سوشیالوجی پڑھاتے ہیں سائنس دانوں پر ڈالے جانے والے دباؤ کا انکشاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سائنس سے متعلقہ افراد کی مارکیٹنگ کا سلسلہ 200 سال سے جاری ہے۔سائنس دان کہلانے کے لیے تمہیں اپنا منہ بند رکھنا اور مذہب کی جکڑ بندیوں سے خود کو آزاد رکھنا ہوگا۔ریسرچ یونیورسٹیوں میں مذہبی لوگ اپنے منہ بند رکھتے ہیں اور غیر مذہبی لوگ الگ تھلگ رہتے ہیں۔انہیں خصوصی سلوک کا مستحق گردانا جاتا ہے اور انہیں اعلیٰ مناصب پر پہنچنے کے مواقع دیے جاتے ہیں۔(15)

☆موجودہ حالات اور سائنس دان

آج حالات بدل چکے ہیں۔مذہب اور سائنس کے درمیان مصنوعی فرق کو سائنسی دریافتوں نے حقائق کے منافی قرار دے دیا ہے۔مذہب کا دعویٰ ہے کہ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا گیا ہے اور سائنس نے اس حقیقت کے کئی ثبوت دریافت کرلیے ہیں۔مذہب یہ تعلیم دیتا ہے کہ زندہ اشیاء کو اللہ تعالیٰ نے تخلیق کیا ہے اور سائنس نے زندہ اجسام کے ڈیزائن میں اس حقیقت کے شواہد دریافت کرلیے ہیں۔مادہ پرست لوگ جو سائنس اور مذہب کو ایک دوسرے کا دشمن قرار دینا چاہتے ہیں نہ صرف کیتھولک کلیسا کی بے جا سخت گیری کو بطور مثال پیش کرتے ہیں بلکہ تورات یا انجیل کے بعض حصوں کا حوالہ دے کر یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ یہ تعلیمات کس قدر سائنسی دریافتوں سے متصادم ہیں۔تاہم ایک

سچائی جسے وہ نظر انداز کرتے ہیں یا اس سے ناواقفیت کا بہانہ کرتے ہیں، یہ ہے کہ انجیل اور تورات کے متن تحریف شدہ ہیں۔ان دونوں آسمانی کتابوں میں انسانوں نے بہت سے توہمات اپنی طرف سے شامل کردیے ہیں۔اس لیے ان کتابوں کو مذہب کے بنیادی مآخذ کے طور پر پیش کرنا غلط ہوگا۔

ان کے برعکس قرآن پورے کا پورا وحیٔ الٰہی پر مشتمل ہے'اس میں رتی بھر تحریف نہیں ہوئی اور نہ ہی ایک لفظ کی کوئی کمی بیشی ہوئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن میں کوئی تضاد یا کوئی غلطی نہیں۔اس میں بیان کردہ حقائق سائنسی دریافتوں سے بے حد مطابقت رکھتے ہیں۔مزید برآں متعدد سائنسی حقیقتیں جو آج منظر عام پر آسکیں ہیں، قرآن نے 1400 سال پہلے ان کا اعلان کر دیا تھا۔یہ قرآن کا ایک اہم معجزہ ہے جو اس کے کلام اللہ ہونے کے متعدد قطعی شواہد میں سے ایک ہے۔(16)

حواشی

(1)۔ سائنسی انکشافات قران وحدیث کی روشنی میں۔صفحہ 33

(2)۔ یوسف،105:12

(3)۔ البقرہ،164:02

(4)۔ الموٴمن، 24:57

(5)۔ تفسیر ابن کثیر، جلد سوم، صفحہ 372

(6)۔ (ابن ماجہ 224/ترمذی218)

(7)۔(ترمذی279)

(8)۔(بحوالہ الشمس والقمر بحسبان: ص37-38)

(9)۔ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۃ الانبیا، حاشیہ 35

(10)۔The Quran and Modern Science by Dr. Page:11

(11)۔بائبل، قرآن اور سائنس از ڈاکٹر موریس بوکائیے، صفحہ 20-21

(12)۔ مماس (Tangent) دائرے کو ایک نقطے پر چھونے والا خط۔اور مماس التمام (Cotangent) کسی قوس یا زاویئے کا مخصوص جزو۔(Gem Advanced Paractial Dictionary)

(13)۔ خط قاطع (Secant)※ دائرے کا نصف قطر جو قاطع التمام ہو۔(Gem Advanced Paractial Dictionary)

(14)۔ THE MESSIANIC LEGACY, GEORGI BOOKS, LONDON-1991: p.177-178,

(15)۔ EDWARD J. LARRY WITHAM, LARSON VE, Scientists and Religion in America, SCIENETIFIC AMERICAN, SEP.1999, p.81

(16)۔ بحوالہ قرآن رہنمائے سائنس صفحہ 87-99☆☆☆

آغاز زندگی کا نظریہ

آغاز زندگی کا نظریہ مختلف مذاہب میں مختلف ہے۔۔۔لیکن جو نظریہ سائنس کا ہے۔۔۔۔۔۔

یعنی کہ" بگ بینگ" ۔قرآن میں ہے کہ:۔۔أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ O

اور کیا کافر لوگوں نے نہیں دیکھا کہ جملہ آسمانی کائنات اور زمین (سب) ایک اکائی کی شکل میں جڑے ہوئے تھے پس ہم نے ان کو پھاڑ کر جدا کر دیا، اور ہم نے (زمین پر) پیکرِ حیات (کی زندگی) کی نمود پانی سے کی، تو کیا وہ (قرآن کے بیان کردہ اِن حقائق سے آگاہ ہو کر بھی) ایمان نہیں لاتے o

بگ بینگ ایک بڑے دھماکے کو کہا جاتا ہے۔۔کائنات آغاز میں ایک بہت بڑے گیس کے گولے کی صورت تھی۔ یہ گیسی گولا ایک عظیم دھماکے سے یوں پھٹا کہ خلا میں دور دور تک اس کے ذرات پھیل گئے۔ان ذرات سے ستارے اور سیارے وجود میں آئے۔زمیں جو پہلے گاڑھے سیال مادے پر مشتمل تھی۔ریڈی ایشن بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے درجہ حرارت بہت زیادہ تھا۔جس کی وجہ سے وہ مادہ اہستہ اہستہ پتلا ہوتا گیا۔۔ یہاں تک کے پانی بن گیا۔اور اس پانی کی میں کچھ غیر نامیاتی عناصر کہ ملنے سے ایک خلیہ بنا جوز میں پر زندگی کی ابتدا تھی،۔۔بالکل اسی طرح۔ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ O

پھر اس کی نسل رکھی ایک بے قدر پانی کے خلاصہ سے

o ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ

پھر اسے ٹھیک کیا اور اس میں اپنی طرف کی روح پھونکی اور تمہیں کان اور آنکھیں اور دل عطا فرمائے۔کیا ہی تھوڑا احق مانتے ہو

اسی طرح جب ایک سیل پیدا ہو جاتا ہے تو وہ ایک سے دو، دو سے تین اور یوں بڑھتے چلے جاتے۔۔حتی کہ ایک ٹشو وجود میں آتا ہے۔۔ٹشو سے آرگن بنتا ہے اور آرگن سے اعضا بنتے ہیں جیسا کہ اللہ نے فرمایا: اس (میں اعضاء) کو درست کیا اور اس میں اپنی روحِ (حیات) پھونکی اور تمہارے لئے (رحمِ مادر ہی میں پہلے) کان اور (پھر) آنکھیں اور (پھر) دل و دماغ بنائے، تم بہت ہی کم شکر ادا کرتے ہو" یہ واحد نظریہ ہے جو سائنس کہ نظریہ کہ قریب ترین ہے۔

سمندر میں میٹھے اور تلخ پانی کا وجود

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

(مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ. بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ)

اس نے دو سمندر بہائے کہ دیکھنے میں معلوم ہوں ملے ہوئے، اور ہے ان میں روک کہ ایک دوسرے پر بڑھ نہیں سکتا (1)

دوسرے مقام پر ارشاد ربّانی ہے:

(وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا)

اور وہی ہے جس نے ملے ہوئے رواں کئے دو سمندر یہ میٹھا ہے نہایت شیریں اور یہ کھاری ہے نہایت تلخ اور ان کے بیچ میں پردہ رکھا اور روکی ہوئی آڑ (2)

مرج کا لغوی معنی دو چیزوں کو اس طرح ملانا یا ان کا آپس میں اس طرح ملنا ہے کہ ان دونوں کی انفرادی حیثیت اور خواص برقرار رہیں۔ جیسے غصن مریج باہم گتھی ہوئی ٹہنی (مفردات امام راغب) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی ایک نہایت محیر العقول نشانی بتائی ہے۔(3)

جدید سائنس نے انکشاف کیا ہے کہ دو مختلف سمندر جہاں آپس میں ملتے ہیں وہاں ان کے درمیان ایک ایسا پردہ حائل ہوتا ہے جو ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھتا ہے اور ہر سمندر کا اپنا درجہ حرارت، کھاری پن اور کثافت ہوتی ہے(4)

تفسیر باقیات میں اس آیت کی تشریح یوں ہے:

یہ کیفیت ہر اس جگہ رونما ہوتی ہے جہاں کوئی بڑا دریا سمندر میں آ کر گرتا ہے۔ اس کے علاوہ سمندر میں بھی مختلف مقامات پر میٹھے پانی کے چشمے پائے جاتے ہیں جن کا پانی سمندر کے نہایت تلخ پانی کے درمیان بھی اپنی مٹھاس قائم رکھتا ہے۔

ترکی امیر البحر سیدی علی رئیس (کاتب رومی) اپنی کتاب مرأۃ الممالک میں جو سولہویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے، خلیج فارس کے اندر ایسے ہی ایک مقام کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ وہاں آب شور کے نیچے آب شیریں کے چشمے ہیں، جن سے میں خود اپنے بیڑے کے لیے پینے کا

پانی حاصل کرتا رہا ہوں۔موجودہ زمانے میں جب امریکی کمپنی نے سعودی عرب میں تیل نکالنے کا کام شروع کیا تو ابتداً وہ بھی خلیج فارس کے ان چشموں سے پانی حاصل کرتی تھی۔بعد میں ظہران کے پاس کنویں کھود لیے گئے اور ان سے پانی لیا جانے لگا۔بحرین کے قریب بھی سمندر کی تہہ میں آب شیریں کے چشمے ہیں جن سے لوگ کچھ مدت پہلے تک پینے کا پانی حاصل کرتے رہے ہیں۔(5)

اللہ تعالیٰ کی قدرت کا یہ کرشمہ دنیا میں کئی جگہ پر رونما ہوا ہے مثلاً جبل طارق کے مقام پر جہاں بحیرہ روم اور بحر اوقیانوس ملتے ہیں۔اس کے علاوہ کیپ پوائنٹ،کیپ پینینسولا اور ساؤتھ افریقہ کے ان مقامات پر جہاں بحر اوقیانوس اور بحر ہند ملتے ہیں۔علاوہ ازیں مصر میں بھی اس مقام پر جہاں دریائے نیل،بحیرہ روم میں جا کر گرتا ہے،یہی عمل ظہور میں آتا ہے۔(6)

بحیرہ روم کا پانی بحر اوقیانوس کے پانی کے مقابلہ میں گرم،کھارا اور کم کثیف ہوتا ہے۔جب بحیرہ روم جبل طارق پر سے بحر اوقیانوس میں داخل ہوتا ہے تو یہ بحر اوقیانوس کے دہانے پر سے تقریباً ایک ہزار میٹر کی گہرائی تک اپنی گرمی،کھارا پن اور کم کثافتی خصوصیات کے ساتھ کئی سو کلو میٹر دور تک بہتا ہے اور بحیرہ روم کا پانی اپنی گہرائی پر مستحکم رہتا ہے۔

تاہم یہ قدرتی رکاوٹ بڑی بڑی لہروں،طاقتور موجوں اور مدوجزر کو آپس میں ملنے یا حدود سے آگے بڑھنے نہیں دیتی۔قرآن مجید میں اسی بات کو بڑے واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ دو سمندروں کے پانی جہاں آپس میں ملتے ہیں تو ان کے درمیان ایک قدرتی اور انسانی آنکھ کو نظر نہ آنے والی ایک رکاوٹ حائل ہوتی ہے جو ان دونوں پانیوں کو آپس میں ملنے اور گڈمڈ ہونے سے روکتی ہے۔یعنی بظاہر ملے ہوئے ہونے کے باوجود دونوں سمندروں کے پانیوں کے خواص اپنی اپنی جگہ برقرار رہتے ہیں۔

یہاں ایک اور بات قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ سورۃ الرحمٰن میں جب دو سمندروں کے آپس میں ملنے کا ذکر کرتا ہے تو ان کے درمیان رکاوٹ کو صرف ایک لفظ ''برزخ'' سے ظاہر کرتا ہے مگر سورۃ الفرقان میں جب میٹھے اور کھاری پانی کا ذکر فرماتا ہے تو ان کے درمیان رکاوٹ کے لیے الفاظ ''برزخاً و حجراً محجوراً ''استعمال فرماتا ہے۔جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محل وقوع کے لحاظ سے رکاوٹوں کی قسموں اور نوعیت میں فرق ہے۔

اسی چیز کو جدید سائنس نے حال ہی میں معلوم کیا ہے کہ سمندر کے مدوجزر والے دہانوں میں

جہاں میٹھے اور نمکین پانی آپس میں ملتے ہیں صورت حال اس جگہ سے مختلف ہوتی ہے جہاں دو سمندر ملتے ہیں۔تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ دریاؤں کے دہانوں میں تازہ پانی اور کھارے پانی کے درمیان ایک گاڑھے پانی کا حجاب ہوتا ہے جو تازہ پانی اور کھارے پانی کی پرتوں کو ملنے نہیں دیتا۔ یہ حجاب (پردہ) تازہ پانی اور کھارے پانی کے انفرادی خواص سے مختلف کھارے پن کا حامل ہوتا ہے۔ یہ معلومات حال ہی میں حرارت، کثافت، کھارے پن اور آکسیجن کی حل پذیری معلوم کرنے والے جدید ترین آلات کی مدد سے دریافت ہوئی ہیں۔

انسانی آنکھ جس طرح دو سمندروں کے ملاپ کے فرق کو نہیں دیکھ سکتی، اسی طرح مدوجزر کے دہانے میں تین اقسام کے پانی کو نہیں دیکھ سکتی۔یعنی صاف وشفاف، نمکین پانی اور ان کی علیحدگی یعنی (Zone of Separation)۔(7)

چنانچہ اس مسئلہ میں بھی قرآن اور جدید سائنس میں زبردست مماثلت پائی جاتی ہے جبکہ قدرت کے اس کرشمے کو قرآن کے نزول کے صدیوں بعد بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔

حوالہ

(1)۔الرحمن، 55-20,19

(2)۔الفرقان۔53:25

(3)۔بحوالہ تیسیر القرآن،، جلد سوم، حاشیہ 65

(4)۔بحوالہ Principles of Oceangraphy,Davis,Page 92:93

(5)۔تفہیم، جلد سوم۔سورۃ الفرقان، حاشیہ 68

(6)۔بحوالہ قرآن اینڈ ماڈرن سائنس صفحہ 29,28

اسلام اور جدید سائنسی حقائق

درحقیقت آج کے اس سائنسی اور مشینی دور میں دعوت کے اس انداز کی اشد ضرورت ہے تا کہ دلائل کی زبان سمجھنے والوں کو قائل کیا جاسکے۔موجودہ دور میں جدید سائنس نے ہمیں یہ موقع فراہم کیا ہے کہ ہم عام طرزِ دعوت کے ساتھ جدید طرز دعوت کو بھی اپنائیں اور اسے منظم انداز سے دنیا کے سامنے پیش کریں۔اس بات کا اعتراف کیے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ دعوت کی یہ طرز انتہائی کٹھن اور مشکل ہے اور ہمیں اپنے قدم احتیاط کے ساتھ اٹھانا ہوں گے۔میرے خیال میں اس کے لیے درج ذیل باتوں پر توجہ مرکوز رہنی چاہیے:

1) یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ قرآن سائنس کی کتاب نہیں بلکہ یہ نشانیوں یعنی آیات کی کتاب ہے۔قرآن مجید کی ایک ہزار سے زاید آیات کا تعلق سائنس اور سائنسی اُمور سے ہے۔(1) جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بے مثال قدرت اور اسرار و رموز کے متعلق انکشافات کیے ہیں۔ان کو بعض جگہ مفصل اور بعض جگہ اشارۃً بیان کرنے کے بعد انسان کو دعوت فِکر دی ہے۔

2) ہمیں سائنس کو بطور کسوٹی قرآن مجید کو سچا ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کیونکہ قرآن سائنس کی دلیلوں کا محتاج نہیں بلکہ سائنسی نظریات کی حقانیت یا ابطال کو پرکھنے کے لیے قرآن کریم سے رجوع کرنا نہایت ضروری ہے۔سائنسی نظریات انسان کی جانب سے کی جانے والی مادی تحقیق پر مبنی ہیں جن کا کسی ممکنہ نقص سے پاک ہونے کا یقین نہیں کیا جا سکتا۔ایسی کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ جن میں سائنسی بنیادوں پر پیش کیے جانے والے نظریات کو سائنس نے ہی باطل قرار دے دیا ہے۔اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ مسلمان کے لیے کسی چیز کے صحیح یا غلط ہونے اور پرکھنے کے لیے اصل کسوٹی "قرآن مجید" ہی ہے، سائنس نہیں۔ چنانچہ ہمیں صرف انہی سائنسی دریافتوں کا ذکر کرنا چاہیے جو واقعی دلائل اور ثبوت رکھتی ہیں، جبکہ سائنسی مفروضوں کے ذکر سے اجتناب کیا جائے۔

3) اس سوال کا جواب دینا بھی ضروری ہے جو قرآن اور سائنس کے مضمون کو پڑھتے ہوئے کسی کے ذہن میں پیدا ہوسکتا ہے کہ اگر یہ سب کچھ قرآن مجید میں پہلے سے ہی موجود تھا تو تفاسیر میں ان کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا اور آج سائنس کے بتانے کے بعد یہ کیوں کہا جا رہا ہے کہ یہ باتیں تو 14 سو سال پہلے ہی قرآن مجید میں موجود تھیں۔درحقیقت عربی زبان بڑی جامع اور وسیع زبان ہے۔

ایک لفظ کے کئی کئی معانی ہیں نیز کائنات کے اسرار و رموز سے اس وقت کے مسلمان ناواقف تھے۔علاوہ ازیں کسی بھی انوکھی چیز کو سمجھنے یا سمجھانے کے لیے کسی قرینے یا علم کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ قرینہ یا علم جو آج ہمیں سائنس کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے۔سابقہ ادوار کے مفسرین کرام اس سے محروم تھے چنانچہ ہر مفسر نے اپنے دور کے علم اور حالات کے حساب سے قرآنی آیات کی تشریح کی۔

قرآن مجید ایک لفظ کے کئی معانی بتاتا اور استعمال کرتا ہے۔آقائے دو جہاں ﷺ فرمان مبارک ہے کہ:

فُضِّلْتُ عَلَى الاَنْبِيَاءِ بِسِتٍّ، اُعْطِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ

"مجھے دوسرے انبیاء پر جو چھ چیزوں میں فضیلت دی گئی ہے ان میں سے ایک میرا جوامع الکلم ہونا ہے۔"(2)

اس مفہوم کی دوسری حدیث ہے:

واوتیت جوامع الکلم

"اور مجھے جوامع الکلم دیے گئے"(3)

ہند بن ابی ہالہ کی روایت ہے کہ:

کان یتکلم بجوامع الکلم

یعنی "نبی کریم ﷺ کے کلام کو بہت سی خصوصیات کا جامع بنایا گیا ہے"۔(4)

جوامع، جامع کی جمع ہے۔اس کے اندر چیزوں کو اکٹھا کرنے اور سمیٹنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔کلم، کلمہ کی جمع ہے۔اس کے معنی "بات" ہیں، یعنی ایسے اقوال جن کے معنی زیادہ اور الفاظ کم ہوں، یعنی کثیر المعانی الفاظ۔(5)

لہٰذا اگر کسی واقعہ یا نظریہ میں ہمیں قرآن کریم یا کسی صحیح حدیث کی رو سے تضاد یا تعارض نظر آ رہا ہو تو اس کی دو ہی وجوہ ہوسکتی ہیں ایک یہ کہ قرآنی آیت یا صحیح حدیث کے الفاظ میں ایسی تاویل کی گنجائش موجود ہو جس کی اس سے پیشتر ضرورت ہی پیش نہ آئی ہو اور جب اس سے متعلق کوئی واقعہ رونما ہو تو تب ہی ان الفاظ کا مفہوم ذہن میں آتا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ نظریہ بذاتِ خود تجرباتی دور سے گزر رہا ہو اور اپنے مشکوک ہونے کی بناء پر ابھی تک نظریہ کی حد سے آگے نہ بڑھ سکا ہو۔یا جو کچھ بیان کیا جا رہا ہو اس کی بنیاد محض ظنون و قیاسات ہوں جبکہ وحی یقینی علم مہیا کرتی ہے اور انسان کی بھٹکتی ہوئی عقل کے مدتوں کے سفر کو

قریب کر دیتی ہے۔ چناچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَالَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ

بلکہ اسے جھٹلایا جس کے علم پر قابو نہ پایا اور ابھی انہوں نے اس کا انجام نہیں دیکھا ایسے ہی ان سے اگلوں نے جھٹلایا تھا تو دیکھو ظالموں کا کیسا انجام ہوا۔(6)

اور یہ ہے بھی حقیقت کہ کسی چیز کے متعلق انسان کا علم خواہ کتنا ہی ترقی کر جائے وہ محدود ہی ہوگا اور اس کے بعد بھی اس چیز کے متعلق مزید انکشافات ہوتے رہیں گے جبکہ اللہ تعالیٰ کا علم لا محدود ہے اور وہ اس چیز کا خالق ہے۔ جو کچھ وہ جانتا ہے دوسرا کوئی جان نہیں سکتا۔ چناچہ ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک نہایت جامع اور بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا، جس سے سامعین بہت متاثر ہوئے۔ ان سامعین میں سے کسی نے حضرت موسیٰ سے پوچھا، ''کیا اس دنیا میں آپ سے بڑھ کر بھی کوئی عالم ہے؟'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا۔ ''نہیں''۔ اللہ تعالیٰ کو موسیٰ کا یہ جواب پسند نہ آیا، لہٰذا انہیں حکم دیا کہ وہ ہمارے فلاں بندے (حضرت خضر) کو جا کر ملیں۔

حضرت موسیٰ نے ایک ہمسفر اپنے ساتھ لیا اور بہت مشقت کے بعد حضرت خضر کو ملنے میں کامیاب ہوئے۔ ابتدائی گفتگو کے بعد ان کے ساتھ سفر کا آغاز کیا۔ دوران سفر تین ایسے واقعات پیش آئے جو صریحاً خلافِ عقل تھے، لہٰذا حضرت موسیٰ نے فوراً ان پر اعتراضات کر دیئے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ بعدہ حضرت خضر نے ان واقعات کی تاویل سے مطلع کرنے کے بعد فرمایا: ''موسیٰ! میرا علم اور تمہارا علم دونوں مل کر اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلہ میں ایسے ہی ہیں جیسے اس سمندر کے مقابلہ میں پانی کا ایک قطرہ''۔

یہ واقعہ قرآن کریم اور کتب احادیث میں تفصیل سے مذکور ہے اور اسے بیان کرنے سے غرض یہ ہے کہ جب انسان کا علم اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلہ میں اتنا کم ہے تو پھر کم از کم ایک مسلمان کو کیا حق ہے کہ وہ کتاب اللہ یا کسی صحیح حدیث کے مقابلہ میں اپنے یا دوسرے لوگوں کے علم اور نظریات پر انحصار کرے۔

دور حاظر میں اس کی مثال یہودیوں کی سلطنت اسرائیل کا قیام ہے۔ مدّتوں یہی سمجھا جاتا رہا کہ یہودی چونکہ ایک مغضوب علیہ قوم ہے اور ذلّت و مسکنت اس کے مقدر کر دی گئی ہے لہٰذا یہ کبھی حکمران نہیں بن سکتے اور جب ان کی سلطنت قائم ہوگئی تو بہت سے اہل علم کے بھی چھکے چھوٹ گئے کہ یہ

بن گیا؟ یہ بات تو قرآن کے خلاف ہے حالانکہ قرآن ہی میں آیت مبارکہ کے اگلے الفاظ کچھ اس طرح ہیں :

اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ

الّا یہ کہ اللہ کی یا لوگوں کی پناہ میں آ جائیں ۔(7)

ان الفاظ کی رو سے دو صورتوں میں یہودی سلطنت وجود میں آ سکتی ہے ایک یہ کہ وہ اللہ کے دین پر کاربند ہو جائیں اور کم از کم اپنی طرف سے منزل من اللہ کتاب پر پوری طرح عمل پیرا ہوں ۔ اور دوسرے یہ کہ دوسرے لوگوں کی حکومتوں کی شہ پر ان کی سلطنت قائم ہو سکتی ہے، اور حقیقتاً ایسا ہی ہے کہ یہ سلطنت برطانیہ، فرانس اور امریکہ کی شہ پر قائم ہوئی ۔ پھر روس بھی ان کا ہمنوا بن گیا اور تمام اسلام دشمن طاقتوں نے مل کر اسلامی ممالک کے وسط میں اسرائیل قائم کر کے مسلمانوں پر خطرناک وار کر دیا ۔

غور فرمائیے آیت کے مندرجہ بالا الفاظ نازل تو دور نبوی میں ہوئے تھے جنہیں مسلمان ہر دور میں پڑھتے رہے لیکن ان کے معانی کی طرف کسی نے کم ہی غور کیا ہوگا پھر جب یہود کی سلطنت قائم ہوگئی تو یہ الفاظ بھی سامنے آ گئے ۔ یہ ہے وَلَمَّا یَاْتِہِمْ تَاْوِیْلُہٗ کا مطلب ۔

اسی طرح جب موجودہ دور میں انسان چاند پر پہنچ گیا تو کئی لوگ اس سے سخت حیران و پریشان ہو گئے اور اس حقیقت کا ہی انکار کرنے لگے ۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ انسان زمینی حدود سے آگے نہیں جا سکتا۔ ان کی وجہ استدلال یہ آیت تھی:۔

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ

اے جن و انسان کے گروہ اگر تم سے ہو سکے کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ جہاں نکل کر جاؤ گے اسی کی سلطنت ہے(8)

غور فرمائیے اس آیت میں کوئی ایسی بات نہیں جو انسان کو زمین کی حدود ہی تک محدود رہنے کی پابند بناتی ہو اور اگر کوئی شخص ایسا سمجھتا ہے تو یہ اس کی اپنی کم فہمی ہے کیونکہ آیت بالا میں اور آسمانوں اور زمین کے اقطار کا ذکر ہے صرف زمین نہیں ۔ لہٰذا اگر کوئی شخص چاند یا کسی دوسرے سیارے تک پہنچ جائے تو اقطار السمٰوات والارض سے باہر نہیں گیا۔ دوسرے اس آیت میں یہ بھی مذکور

ہے کہ سلطان (قوت، زور، غلبہ) سے تم اقطار السموات والارض سے آگے بھی جا سکتے ہو۔ اسی دور میں علامہ اقبال نے یہ شعر کہا تھا۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفٰے سے مجھے
کہ عالم بشریّت کی زد میں ہے گردوں

اندریں صورت یہ بات پوری طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جب کوئی ایسا واقعہ یا نظریہ درپیش آئے جو بظاہر اسلام کے خلاف معلوم ہوتا ہو تو اسے فی الواقعہ اسلام کے خلاف نہ سمجھ لینا چاہیے بلکہ اسی کی تاویل پر غور کرنا چاہیے یا تاویل کا انتظار کرنا چاہیے اور ایسی صورت حال کو اپنی کم علمی اور کم فہمی پر محمول کرنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قول وفعل میں کبھی تضاد واقع نہیں ہو سکتا اور اگر وہ فی الواقعہ اسلام کے خلاف ثابت ہو جائے تو دلائل کے ساتھ ایسے نظریہ کی پرزور تردید کرنا چاہیے۔(9)

4 حواشی

(1)۔ 05:The Quran and Modern Science Page

(2)۔ صحیح مسلم از امام مسلم بن حجاج القشیری جلد 5 صفحہ 5

(3)۔ البیان والتبیین از جاحظ جلد 4 صفحہ 29

(4)۔ صحیح بخاری کتاب التعبیر

(5)۔ القاموس الوحید از مولانا وحید الزمان قاسمی کیرانوی

(6)۔ 39/10

(7)۔ 112/3

(8)۔ 33/55

(9)۔ الشمس والقمر۔ ص 80-83

اللہ تعالیٰ کی قدرت کا

عظیم الشان شاہکار: ایٹم

مادہ سے مراد وہ عنصر ہے جس سے تمام مادی اشیاء بنی ہوئی ہیں۔قدیم یونانی فلسفیوں نے سب سے پہلے یہ جاننے کی کوشش کی کہ دنیا کس چیز سے بنی ہے۔انہوں نے ان بنیادی ذرات کا نام ایٹم رکھا جو آج تک رائج ہے۔بنیادی ذرے کی تعریف سادہ الفاظ میں یوں کر سکتے ہیں کہ یہ مادے کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ ہوتا ہے جو کہ اپنی ساخت میں کامل ہوتا ہے اور اپنے اندر مزید چھوٹے یا ذیلی ذرات نہیں رکھتا۔ایٹم جو مادے کے وجود کے لیے بنیادی کردار ادا کرتا ہے، بگ بینگ کے بعد وجود میں آیا۔پھر ان ایٹموں نے یکجا ہو کر اس کائنات کو بنایا جس میں ستارے، زمین اور سورج شامل تھے۔بعد ازاں انہی ایٹموں نے کرۂ ارض پر زندگی کی ابتدا کی۔اگر آپ اپنے چاروں طرف نظر دوڑائیں تو آپ کو سینکڑوں قسم کی چیزیں نظر آئیں گی۔ان میں سے کچھ ٹھوس ہیں، کچھ مائع اور کچھ گیس،یہ مادے کی تین مختلف صورتیں ہیں۔وہ ظاہر میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن اندرونی طور پر ایسا نہیں ہے۔بنیادی طور پر وہ ایک ہی ذرے سے تعمیر ہوئی ہیں جسے ایٹم کہتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ پھر یہ ایٹم کیا ہے، جو ہر شے کا تعمیری جزو ہے، یہ کس شے کا بنا ہوا ہے اور اس کی ساخت کیا ہے؟

پرانے وقتوں میں ایک نظریہ جو کہ 'نظریہ ایٹم'' کے نام سے جانا جاتا تھا، کو وسیع پیمانے پر مقبولیت حاصل تھی۔اصل میں یہ نظریہ یونان کے ایک سکالر ڈیموکراٹس کا پیش کردہ تھا جو تقریباً (460-370) قبل مسیح وہاں رہتا تھا۔ڈیموکراٹس اور اس کے بعد آنے والے لوگوں نے بھی یہی نظریہ پیش کیا تھا کہ ایٹم مادے کا سب سے چھوٹا حصہ ہوتا ہے۔ایٹم دراصل یونانی زبان کے لفظ ATOMOS سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے ''ناقابل تقسیم''۔یونانی فلاسفرز کا خیال تھا کہ ایٹم کو تباہ نہیں کیا جا سکتا اور اس کی مزید تقسیم ناممکن ہے۔قدیم عرب بھی اسی بات پر یقین رکھتے تھے۔عربی زبان میں ''ذَرَۃ'' کا سب سے عمدہ معنی ''ایٹم'' ہی ہے۔

چنانچہ ایٹم کے متعلق یہ نظریہ 2300 سال تک قائم رہا تا آنکہ 1803ء میں سائنسدان

جان ڈالٹن نے عملی طور پر ایک مفید ایٹمی نظریہ پیش کیا اور ایٹم کو ایک ایسا کُرہ قرار دیا جو مثبت برقی قوت کے حامل ذروں اور منفی الیکٹرونز سے بھرا ہوا ہے۔ چنانچہ 1897ء میں سائنسدانوں نے مزید تجربات کے بعد اس میں الیکٹرونز کو دریافت کیا اور پھر 1911ء میں ایٹم کے مرکزی حصے نیوکلیس کو دریافت کیا گیا۔ یہ تجربات جاری رہے اور سائنسدان کائنات کے اس چھوٹے سے ذرے کا مزید باریک بینی سے جائزہ لیتے رہے۔ ان کی یہ جدوجہد رنگ لائی اور 1918ء میں اسی ایٹم کے مرکز میں پائے جانے والے نیوکلیس کے اندر پروٹان کو دریافت کیا گیا اور پھر چند سالوں بعد 1932ء میں اسی نیوکلیس کے اندر نیوٹران کو بھی دریافت کرلیا گیا۔ 1968ء میں انہوں نے پروٹان اور نیوٹران کے اندر مزید چھوٹے اجزا کو دریافت کرنے کا اعلان کردیا۔ ان چھوٹے اجزا کو، کوارکس (Quarks) کا نام دیا گیا ہے، ہر پروٹون اور نیوٹران کے اندر تین تین کوارکس ہوتے ہیں جو آپس میں مزید دوسرے اجزا گلونز (Gluons) کے ذریعے جڑے ہوتے ہیں۔ ابھی بھی سائنسدانوں کی کھوج کی رفتار کم نہیں ہوئی ہے بلکہ ان بنیادی ذرات پر تحقیق کا بازار گرم ہے اور کوئی بعید نہیں کہ آنے والے دنوں میں کوارکس (اور کچھ اور ایسے ذرات جن کو آج بنیادی کہا جاتا ہے) میں سے بھی مزید چھوٹے ذرات نکل آئیں۔

جب ہم ایٹموں کی ساخت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان سب کا ایک نمایاں ڈیزائن ہے اور یہ ایک خاص ترتیب و نظم کے ساتھ وجود میں آئے ہیں۔ ہر ایٹم کا ایک نیوکلیس ہوتا ہے جس میں مختلف تعداد میں پروٹون اور نیوٹرون ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں ایسے الیکٹرون ہوتے ہیں جو نیوکلیس کے گرد مخصوص مداروں میں حرکت کرتے ہیں۔ ایک ایٹم کے اندر الیکٹرون اور پروٹون مساوی تعداد میں ہوتے ہیں۔ الیکٹرون پر منفی چارج جبکہ پروٹون پر مثبت چارج ہوتا ہے۔ جس سے مثبت اور منفی برقی قوت رکھنے والے الیکٹرون اور پروٹون ایک دوسرے کا توازن برقرار رکھتے ہیں۔ ان اعداد میں سے ایک بھی مختلف ہوتا تو ایٹم کا وجود ہی نہ ہوتا، اس لیے کہ اس سے برقی مقناطیسی توازن بگڑ جاتا تھا۔ الیکٹرون، پروٹون کی نسبت ہلکے ہوتے ہیں۔ 1836 الیکٹرونز ایک پروٹون کے برابر ہوتے ہیں جبکہ پروٹون اور نیوٹران بلحاظ کمیت تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں۔

کسی ایٹم میں ایک پروٹون کے اضافے سے وہ نئی قسم کا ایٹم بن جاتا ہے۔ جو مادہ ایک ہی قسم کے ایٹموں سے مل کر بنا ہوا سے عنصر کہتے ہیں۔ مثلاً ہائیڈروجن، آکسیجن اور کاربن وغیرہ عناصر کی مختلف اقسام ہیں۔ اب تک تقریباً 118 عناصر کو دریافت کیا جاچکا ہے ان میں سے زیادہ تر قدرتی طور

پر پائے گئے ہیں جبکہ کچھ لیبارٹری میں تیار کیے گئے ہیں ۔سب سے سادہ ترین ایٹم ہائیڈروجن کا ہے ۔اس میں ایک پروٹون اور ایک ہی الیکٹرون ہوتا ہے جبکہ نیوٹرون نہیں ہوتا۔دو یا دو سے زائد ایٹموں کے ملنے سے مالیکیول تشکیل پاتا ہے،مثلاً جب عنصر ہائیڈروجن کے دو ایٹم ،عنصر آکسیجن کے ایک ایٹم سے ملائے جاتے ہیں تو پانی کا ایک مالیکیول تشکیل پاتا ہے۔

آئیے اب یہ معلوم کرتے ہیں کہ ایٹم اور اس کے ذرات کتنے چھوٹے ہیں ۔الیکٹرون کو وزن کے لحاظ سے ہلکے ترین اجزاء میں شمار کیا جاتا ہے ایک قطرہ پانی کا وزن ایک الیکٹرون کی نسبت اربوں گنا زیادہ ہوتا ہے ۔اگر ہم پینسل سے ایک سینٹی میٹر لائن کھینچیں تو اس لائن میں 10 کروڑ ایٹم سما سکتے ہیں ۔اگر ہم ایٹم کی سکیل کے حساب سے ڈرائنگ بنائیں اور پروٹون اور نیوٹرون کے قطر کا سائز ایک سینٹی میٹر رکھیں تو الیکٹرون اور کوارکس کا سائز انسانی بال کے سائز سے بھی چھوٹا ہوگا جبکہ پورے ایٹم کا سائز تیس فٹ بال کے میدان کے برابر ہوگا۔ نیوکلیس ایٹم سے اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ اگر ہم ایٹم کو فٹ بال کے میدان جتنا بڑا پھیلا دیں تو نیوکلیس ایک انگور کے دانہ کے برابر ہوگا۔آئیے اب اس بات کو سمجھتے ہیں کہ الیکٹرون نیوکلیس سے کس قدر دوری سے مخصوص مداروں میں گردش کرتے ہیں ۔اس کے لیے اگر نیوکلیس کو گولف بال کے برابر تصور کیا جائے تو اس کے گرد گردش کرنے والے الیکٹرونز کا پہلا مدار اس سے ایک کلو میٹر دور ہوگا جبکہ دوسرا مدار چار کلو میٹر اور تیسرا مدار نو کلو میٹر دور ہوگا۔اسی طرح باقی مداروں کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے ۔ایک اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اگرچہ نیوکلیس کی جسامت ایٹم کی جسامت سے اس قدر چھوٹی ہے لیکن اس کی کمیت ایٹم کی کل کمیت کا 95.99٪ ہوتی ہے ۔کتنی حیران کن بات ہے کہ ایک شے ایک طرف تو کمیت کا تقریباً سارا حصہ ہے اور دوسری طرف نہ ہونے کے برابر جگہ گھیرتی ہے ۔اور ایٹم کا 99999999999.99٪ حصہ خالی ہے ۔علاوہ ازیں سائنسدانوں نے نہ صرف ان قوتوں کو دریافت کرلیا ہے کہ جنہوں نے ان چھوٹے چھوٹے ایٹموں کو آپس میں جکڑ رکھا ہے بلکہ اس طریقے کو بھی معلوم کرلیا ہے کہ جس کے ذریعے ان قوتوں کو ان ایٹموں سے جدا کیا جاسکتا ہے ۔اسی طریقہ کو نیوکلیر پاور پلانٹ میں استعمال کرتے ہوئے بجلی حاصل کی جاتی ہے ۔جو کہ آج کے دور کی بنیادی ضرورت ہے۔

قارئین کرام آپ اللہ تعالیٰ کی بے نظیر اور عظیم الشان طاقت وقدرت اور علیم وخبیر ہونے کا اندازہ مندرجہ بالا معلومات سے لگاسکتے ہیں کہ اس نے ایک چھوٹے سے ذرے کے اندر کیا کچھ تخلیق

کر رکھا ہے اور اس کے اندر کس قدر قوت موجود ہے کہ ہماری عقلیں اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں ۔اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کی وسعت کا اعلان چودہ صدیاں پہلے درج ذیل آیت کریمہ میں اس وقت کیا تھا کہ جب ایٹم کو کائنات کا چھوٹا ترین ذرہ تصور کیا جاتا تھا۔فرمان باری تعالیٰ نازل ہوتا ہے:

وَ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَاتِينَا السَّاعَةُ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّى لَتَاتِيَنَّكُمْ عٰلِمِ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ وَلَا اَصْغَرُ مِن ذٰلِكَ وَلَا اَكْبَرُ اِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِينٍ

اور کافر بولے ہم پر قیامت نہ آئے گی تم فرماؤ کیوں نہیں میرے رب کی قسم بیشک ضرور تم پر آئے گی غیب جاننے والا اس سے غیب نہیں ذرہ بھر کوئی چیز آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی مگر ایک صاف بتانے والی کتاب میں ہے') سبا، 03:34

یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کے لا محدود علم کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کے متعلق علم رکھتا ہے جو خواہ چھپی ہوں یا ظاہر۔اور اللہ تعالیٰ ہر اس چیز کے بارے میں بھی علم رکھتا ہے جو ایٹم یعنی ذرے سے چھوٹی ہو یا بڑی۔ چنانچہ اس آیت کریمہ سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ ایٹم سے بھی چھوٹی چیز کا وجود دنیا میں ممکن ہے جبکہ اس حقیقت کو انسان نے بیسویں صدی میں دریافت کیا ہے۔قرآن کے اس دعویٰ پر جدید سائنس کی تصدیق کی مہر ثبت ہونے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہ واقعتا اللہ تعالیٰ کے سچے کلمات سے بھرپور وہ کتاب ہدایت ہے جو اس نے اپنے محبوب ترین بندے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی تھی۔اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر اپنا ایمان مضبوط رکھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

حواشی

(1)۔ اللہ کی نشانیاں۔صفحہ 27-28

18.PageThe Quran and Modern science

http://en.wikipedia.org/wiki/Atom

http://ur.wikipedia.org/wiki/atom

http://particleadventure.org/modern_atom.html

اللہ مشارق اور مغارب کا رب ہے

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ

دونوں پورب کا رب اور دونوں پچھّم کا رب (الرحمٰن۔ 17:55)

عربی زبان میں جمع دو طرح کا ہوتا ہے۔ایک تثنیہ اور دوسرا' جمع۔دو اشیا ہوں تو ان کو تثنیہ کہتے ہیں جبکہ دو سے زاید اشیا کو عربی میں جمع کہتے ہیں۔(1)

اس آیت کریمہ میں لفظ تثنیہ استعمال ہوا ہے۔یعنی دو مشرقوں اور دو مغربوں کا رب۔جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں غروب ہوتا ہے۔سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ سورج کے طلوع ہونے کا زاویہ ہر روز مختلف ہوتا ہے اور اسی طرح جب یہ مغرب میں غروب ہوتا ہے تو اس کا زاویہ بھی ہر روز مختلف ہوتا ہے۔سال میں صرف دو دن ایسے ہیں کہ سورج مشرق کے انتہائی دور دراز مقام سے طلوع ہوتا ہے اور پھر اسی کے مطابق مغرب کے انتہائی دور دراز مقامات پر غروب ہوتا ہے۔علاوہ ازیں سال میں دو دن 20/21 مارچ اور 22/23 ستمبر کو سورج کچھ وقت کے لیے عین خط استوا کے مقام سے گزرتا ہے۔اس تاریخ کو رات اور دن کی لمبائی ایک جیسی ہوتی ہے ان وقتوں کو Equinox کہا جاتا ہے۔

21 جون کو سورج مشرق سے شمال کی جانب 5.23 درجے سے طلوع ہوتا ہے اور پھر اسی مناسبت سے مغرب میں 5.23 درجے شمال کی جانب غروب ہوتا ہے۔یہ موسم گرما کا سب سے لمبا دن ہوتا ہے۔جس کو (Summer Solstice) کہتے ہیں۔علاوہ ازیں اس وقت زمین کے نصف شمالی کرہ میں موسم گرما ہوتا ہے اور باقی نصف کرہ جنوبی میں موسم سرما ہوتا ہے۔یعنی یہ دن کرہ شمالی والوں کے لیے (Summer Solstice) کہلائے گا مگر کرہ جنوبی والوں کے لیے (Winter Solstice) کہلائے گا۔

اسی طرح 21/22 دسمبر کو سورج مشرق سے جنوب کی جانب 5.23 درجے سے طلوع ہوتا ہے اور اسی مناسبت سے یہ مغرب میں 5.23 درجے جنوب کی جانب غروب ہوتا ہے۔ یہ موسم سرما کا سب سے چھوٹا دن ہوتا ہے۔اس کو کہتے ہیں۔

اس وقت زمین کے نصف کرہ جنوبی میں موسم گرما ہوتا ہے اور باقی نصف کرہ شمالی میں موسم سرما ہوتا ہے۔یعنی یہ دن کرہ شمالی والوں کے لیے تو (Winter Solstice) کہلائے گا مگر کرہ جنوبی والوں کے لیے (Summer Solstice) کہلائے گا۔ چنانچہ سال میں دو دن سورج مشرق کے دو انتہائی مقامات (جن کے درمیان 47 درجے کا فاصلہ ہے) سے طلوع ہوتا ہے اور پھر اسی ترتیب سے مغرب کے دو انتہائی مقامات پر غروب ہوتا ہے۔(2) چنانچہ مندرجہ بالا آیت سے یہ ہی مراد معلوم ہوتی ہے کہ رب دو مشرقوں اور دو مغربوں کا رب ہے۔(واللہ اعلم)۔مگر قرآن مجید میں ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَ الْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ

تو مجھے قسم ہے اس کی جو سب پوربوں سب پچھموں کا مالک ہے کہ ضرور ہم قادر ہیں (المعارج، 40:70)

اس آیت میں لفظ مشارق اور مغارب، تثنیہ نہیں بلکہ جمع ہے یعنی کئی مشرق اور کئی مغرب۔جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ سورج سال میں صرف دو دن مشرق اور مغرب کے انتہائی دور دراز مقامات سے طلوع ہوتا ہے جبکہ باقی دنوں میں وہ ہر روز ایک نئے درجے سے طلوع و غروب ہوتا ہے۔اس لحاظ سے سورج کے کئی مشارق اور مغارب ہوئے۔ چنانچہ جدید سائنس اور قرآن کی مندرجہ بالا آیات میں زبردست مطابقت پائی جاتی ہے۔اس میں کوئی اختلاف نظر نہیں آتا۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے کہ ان آیات کا صحیح مفہوم کیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ مستقبل کی جدید سائنس ہمیں ان آیات کے مفہوم کو اور زیادہ بہتر انداز میں سمجھنے کے لیے نئی معلومات فراہم کردے۔(واللہ اعلم)

حواشی

(1)۔آسان لغاتِ قرآن، صفحہ 25

(2)http://www.cse.ohio-state.edu/~wengerk/astro/naastro.html

انسان کی جلد میں درد کو محسوس کرنے والا نظام پایا جاتا ہے

سطحی رقبے کے لحاظ سے انسانی جسم کا سب سے بڑا اور اہم ترین جزو جلد ہی ہے۔ یہ نہ صرف تمام جسم کو بیرونی طور پر ڈھانپتی ہے، بلکہ جسم کے سوراخوں (منہ، ناک، کان، پیشاب اور پاخانے کے سوراخ) میں اندر تک جاتی ہے۔ حتیٰ کہ آنکھ کے ڈیلے پر بھی یہ ایک باریک شفاف جھلی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مزید یہ کہ جسم پر موجود بال اور ناخن بھی حقیقت میں جلد ہی کے زائدے ہیں۔ یہ جلد جسم کے اعضا کو بیرونی صدموں اور چوٹوں سے بچاتی ہے۔ نیز جراثیم اور دیگر خوردبینی جانداروں کے حملے سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ سورج سے آنے والی بالائے بنفشی شعاعوں سے بھی جسم کو بچانا اس کا کام ہے۔

جلد میں خون کا ایک الگ ترسیلی نظام ہوتا ہے اور خون کی نہایت باریک شعری نالیاں جلد کے اندرونی حصے میں بہت زیادہ پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ جلد کی بیرونی سطح پر اعصاب کے بہت سے سرے پائے جاتے ہیں جو جسم کو بیرونی طور پر درپیش حالات کی اطلاعات دماغ تک پہنچاتے ہیں۔

انسانی جلد کی موٹائی 05.0 سینٹی میٹر سے 65.0 سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔ یہ آنکھ کے پپوٹوں پر سب سے پتلی اور پاؤں کے تلووں پر سب سے موٹی ہوتی ہے۔ انسانی جلد کا کل وزن اڑھائی سے ساڑھے چار کلو گرام تک ہوتا ہے۔ یہ وزن پورے جسم کے وزن کے سولہویں حصے کے برابر اور جگر یا دماغ کے وزن سے دوگنا ہوتا ہے۔ جسم میں گردش کرنے والے سارے خون میں سے ایک تہائی خون اس کی سطح تک پہنچتا ہے۔ اس کا کل سطحی رقبہ 000,20 مربع سینٹی میٹر ہے یعنی اگر اسے کسی ہموار تختے پر پھیلایا جائے تو دو میٹر لمبائی اور ایک میٹر چوڑائی کی ایک چادر بنتی ہے۔ اس کے ہر مربع سینٹی میٹر میں کل 000,00,30 خلیات پائے جاتے ہیں۔ جن میں اوسطاً 10 بال، چکنائی پیدا کرنے والی غدود، عصبی ریشوں کے سروں پر موجود 3000 حسی خلیات، عصبی رگیں 4 گز، لمس کی تحریک وصول کرنے کے لیے 25 فشاری آلات، درد کو ریکارڈ کرنے والے 200 اعصاب کے سرے ٹھنڈک محسوس کرنے والے 2 آلات اور گرمی وصول کرنے والے کل 12 آلات پائے جاتے ہیں۔ اب پوری جلد میں ان ساختوں کی تعداد معلوم کرنے کے لیے ان اعداد کو 000,20 سے ضرب دے لیں۔

یہ جسم کے بیرونی جراثیموں کے خلاف بھی ایک رکاوٹ ہے۔ اس رکاوٹ کے باعث جراثیم جسم میں براہ راست داخل نہیں ہو سکتے۔ اگر کسی وجہ سے جسم پر جلد کا یہ غلاف کہیں کٹ پھٹ جائے تو اس جگہ سے جسم ننگا ہو جاتا ہے اور جراثیموں کے لیے اندر داخل ہونے کا راستہ کھل جاتا ہے۔ تاہم جسم کے خود کار مدافعتی نظام کے باعث یہ جراثیم باہر ہی خون کے خلیوں سے لڑ مر کر ختم ہو جاتے ہیں اور اس دوران جلد پر لگنے والا یہ زخم ایک ماہر رفو گر سے بھی زیادہ ماہرانہ انداز میں خود بخود مندمل ہو جاتا ہے، اس کے بعد بہنے والا خون گاڑھا ہو جاتا ہے اور پھر جیلی کی طرح جم جاتا ہے اور زخم کا منہ خود بخود بند ہو جاتا ہے۔ اس جمے ہوئے خون میں چھوٹے ریشے ہوتے ہیں جو ایک طرح کا جال سا بُن دیتے ہیں۔ تھوڑے عرصے میں یہ کٹی ہوئی جلد مرمت ہو جاتی ہے اور جما ہوا خون آہستہ آہستہ سخت ہو کر کھرنڈ بن جاتا ہے اور پھر خود بخود جھڑ جاتا ہے۔

جلد میں جگہ جگہ ننھے منے اعضائے حاسہ بھی موجود ہوتے ہیں۔ یہ حسی اعضا لمس، حرارت، سردی، دباؤ اور درد کو محسوس کرتے ہیں۔ اور جسم کے مختلف مقامات پر ان کی تعداد مختلف ہوتی ہے۔ یہ اعصاب مرکزی عصبی نظام سے آنے والی تحریکات کو متعلقہ اعضا تک پہنچاتے ہیں اور متعلقہ اعضا سے آنے والی تحریکات کو مرکزی عصبی نظام تک پہنچاتے ہیں۔ مرکزی عصبی نظام سے آنے والے جو اعصاب جلد میں داخل ہوتے ہیں، وہ جلد کی اندرونی تہہ ادمہ (Dermis) میں موجود چھوٹی چھوٹی شریانوں کی دیوار کے سادہ عضلات میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ نیز بالوں کو حرکت دینے والے عضلات اور جلد میں پائے جانے والے پسینے کی غدود میں بھی یہ اعصاب موجود ہوتے ہیں۔ جلد سے مرکزی نظام عصبی کی طرف پیغامات لے جانے والے اعصاب کے سرے (آخذے) مخصوص اور مختلف قسموں کے ہوتے ہیں۔ یہ سرے فرد کے ماحول میں ہونے والی تبدیلیوں سے متاثر ہوتے ہیں اور پھر یہ مرکزی عصبی نظام کو جو پیغامات بھیجتے ہیں اس کے نتیجے میں دماغ میں احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ یوں ان ذرائع سے ہم اپنے جسم کے اردگرد کے ماحول کے بارے میں علم حاصل کر لیتے ہیں۔

جب ننگی جلد پر بالائے بنفشی شعاعیں براہ راست پڑتی ہیں تو جلد کی برادمہ (Epidermis) میں پہلے سے موجود ایک مادہ وٹامن ڈی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ وٹامن بعد میں جسم میں جذب ہو جاتا ہے اور کیلشیم کے انجذاب میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جلد ایک بہت زیادہ موثر حسی عضو ہے۔ اس میں ایسے اعصاب کے سرے پائے جاتے ہیں جو چھونے، درد محسوس کرنے اور درجہ حرارت میں تبدیلی کو دماغ میں محسوس کرانے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ ہماری جلد

ایسی اطلاعات کا ایک اہم ذریعہ ہے جن کی بنا پر ہم جلتی آگ جیسی نقصان دہ تحریکوں (Harmful Stimuli) سے خود کو دور کر لیتے ہیں اور اپنے آپ کو محفوظ مقام پر لے جاتے ہیں۔

ساخت کے لحاظ سے جلد دو تہوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ایک بیرونی پتلی تہہ جس کو برادمہ (Epidermis) کہتے ہیں۔ یہ تہہ برحلمی (Epithelial) خلیوں پر مشتمل ہوتی ہے جو باہم بہت سے زیادہ ٹھنسے ہوتے ہیں۔اس کے نیچے ایک اندرونی موٹی تہہ ہوتی ہے، جوادمہ (Dermis) کہلاتی ہے۔

یہ دونوں تہیں ایک دوسری کے ساتھ مضبوطی سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔البتہ اگر جلد کو بہت زیادہ رگڑ پہنچے تو اس کے نتیجے میں برادمہ چھل کر ادمہ سے الگ ہو جاتی ہے، جیسے ڈھیلا جوتا پہن کر چلنے سے پاؤں کی کھال چھل جاتی ہے۔ بہت زیادہ رگڑ سے جب برادمہ ادمہ سے الگ ہو جائے تو ان دونوں کے درمیان بین خلوی سیال (Interstitial Fluid) جمع ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں یہ دونوں تہیں مزید ایک دوسری سے الگ ہو جاتی ہیں اور یوں برادمہ چھالے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ادمہ کے نیچے ایک زیر جلدی تہہ (Suhcutaneous Layer) ہے۔اس تہہ کو زیرادمہ یا تحت الجلد (Superficial Fascia or Hypodermis) کہا جاتا ہے۔ یہ تہہ خلوی اور شحمی بافتوں پر مشتمل ہے۔ادمہ سے ریشے نکل کر نیچے اس زیرادمہ میں داخل ہوتے ہیں اور جلد کو اس زیرادمہ تہہ کے ساتھ منسلک کرتے ہیں۔ یہ زیرادمہ آگے نیچے موجود بافتوں اور اعضا سے مضبوطی کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔

برادمہ چار یا پانچ خلوی تہوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ برادمہ کی ان خلوی تہوں کی تعداد کا انحصار جسم میں جلد کے محل وقوع پر ہے۔ جہاں جلد کو بیرونی رگڑ کا سب سے زیادہ سامنا کرنا پڑتا ہے، جیسے ہتھیلیاں اور تلوے، وہاں برادمہ کی پانچ تہیں ہیں۔اس کے علاوہ دیگر تمام مقامات پر اس کی چار تہیں ہوتی ہیں۔

جلد کی اندرونی تہہ ادمہ ہے جسے بعض اوقات ''جلد حقیقی'' بھی کہا جاتا ہے۔اس میں خون کی نالیوں، لمفی نالیوں، اعصابی ریشوں اور جلدی غدود کا گھنا جال سا بنا ہوتا ہے۔ یہ تمام چیزیں ایک لچکدار اور ریشے دار بافت، واصلی بافت (Connective Tissue) میں مضبوطی سے جمی ہوتی ہیں۔ یہ لیس دار ریشے ہی دراصل جلد میں تناؤ برقرار رکھتے ہیں۔ بڑھاپے میں یہ ریشے کمزور ہو کر الاسٹک کی تاروں کی طرح ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور یوں جلد میں جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ یہ ادمہ ہتھیلیوں اور تلووں میں بہت موٹی اور آنکھ کے ڈیلے، ذکر اور فوطوں میں بہت پتلی ہوتی ہے۔ پھر جسم کے بطنی جوانب کی

ادمہ بھی موٹائی کا رجحان رکھتی ہے۔

جلد کے اس حصے میں پائے جانے والے غدود دو طرح کے ہوتے ہیں۔ایک پسینے کے غدود، دوسرے چربیلے غدود۔ پسینے کے غدود پسینہ بنانے کے ذمہ دار ہیں۔ یہ غدود ہمارے لیے بہت اہم ہیں کیونکہ ان غدودوں کی وجہ سے ہمارے جسم کا درجہ حرارت ایک خاص حد سے بڑھنے نہیں پاتا۔ چربیلے غدود ایک طرح کی چربی خارج کرتے رہتے ہیں، جسے شحم (Sebum) کہا جاتا ہے۔ یہ چربی جسم کی سطح کے لیے ایک لحاظ سے حفاظتی کام سرانجام دیتی ہے۔ بالوں کی جڑیں اسی حقیقی جلد یعنی ادمہ میں موجود ہوتی ہیں۔(1)

عام طور پر کئی صدیوں سے لوگ یہی بات جانتے تھے کہ تمام جسم کو درد کا احساس ہوتا ہے۔اگر انگلی کو کانٹا بھی لگ جائے تو بجائے اس کے کہ صرف متاثرہ حصے ہی کو درد محسوس ہو، پورے جسم کو درد کا احساس ہوتا ہے۔اور اس وقت لوگ اس بات کو نہیں جانتے تھے کہ انسان کی جلد کے اندر کچھ مخصوص رگیں اور اعصاب ہیں جو درد کی حس اور دوسری حسوں کو محسوس کرتے ہیں، جن سے انسان کا جسم متاثر ہوتا ہے اور وہ اپنا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔یعنی انسان کی جلد کے اندر ہی Pain Receptors پائے جاتے ہیں۔اور ابھی شعبہ علم الاعضا میں جدید تحقیق کے بعد یہ بات سامنے آئی ہے کہ انسان کو ہر قسم کے درد کا احساس، انسان کی جلد میں پائے جانے والے اعصاب اور مخصوص رگ جس کو رگ ختمی (Nerve Ending) کہتے ہیں، کے ذریعے ہوتا ہے۔

انسان کے جسم کے اندر اہم ترین رگیں تین طرح کی ہیں جو مختلف چیزوں کو محسوس کرتی ہیں۔

1۔چھونے کا احساس: خون کا چھوٹے سے چھوٹا جز (Corpuscles) اس حس کو محسوس کرتا ہے جسے Meissners and Merkels Corpuscles کہتے ہیں۔

2۔ درد کا احساس: یہ جلد میں موجود رگ ختمی کے ذریعے محسوس ہوتا ہے۔

3:۔گرمی وحرارت کا احساس: اس حس کی ذمہ داری Ruffini Cylinders Corpuscles پر ہوتی ہے۔

جلد کو درد کا احساس عموماً جلد کے جلنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔جلد کے جلنے کو تین درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے

پہلے درجے کا جلنا: سورج کی تپش اور گرمی سے جلد کی اوپر والی سطح (Epidermis) متاثر ہوجاتی ہے اور اس جگہ میں سوجن اور ورم پیدا ہوتا ہے اور جگہ سرخی مائل ہوجاتی ہے۔جس سے انسان تکلیف محسوس کرتا ہے۔اور عام طور پر یہ تکلیف دو سے تین دن میں ختم ہوجاتی ہے۔

دوسرے درجے کا جلنا:......اس درجے کے جلنے میں انسان کی جلد کا اوپر والا حصّہ (Epidermis) اور اندرونی حصّہ (Dermis)، دونوں زخمی ہوجاتے ہیں یا جل جاتے ہیں۔ دونوں حصّے آپس میں علیحدہ ہوجاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ان دونوں حصّوں کے درمیان بدن کی رطوبات خون سے الگ ہوکر جمع ہوجاتی ہیں۔ اس صورت میں متاثرہ آدمی کو بہت سخت درد ہوتا ہے اور آبلہ یا چھالہ بن جانے کے بعد رگِ ختمی ننگی ہوجاتی ہے اور جب اس کو رگڑ لگتی ہے تو اس کی تکلیف اور درد میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی جلد کو اپنی اصلی حالت میں واپس آنے اور صحت مند ہونے میں تقریباً دو ہفتے لگ جاتے ہیں۔

تیسرے درجے کا جلنا:......اس درجے میں جلد کی پوری تہہ جل جاتی ہے اور ہوسکتا ہے کہ زخم پٹھوں اور ہڈیوں تک پہنچ جائے۔ اس صورت میں جلد میں لچک ختم ہوجاتی ہے۔ اور وہ خشک اور کھردری ہوجاتی ہے۔ اس حالت میں متاثرہ شخص کو زیادہ درد نہیں ہوتا کیونکہ رگِ ختمی اور درد کو محسوس کرنے والے اعصاب تقریباً مکمل طور پر جلنے کی وجہ سے ناکارہ ہوجاتے ہیں (2)۔ اسی بات کی طرف اشارہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِنَا سَوۡفَ نُصۡلِیۡہِمۡ نَارًا ؕ کُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُہُمۡ بَدَّلۡنٰہُمۡ جُلُوۡدًا غَیۡرَہَا لِیَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَزِیۡزًا حَکِیۡمًا

جنہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا عنقریب ہم ان کو آگ میں داخل کریں گے جب کبھی ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کے سوا اور کھالیں انہیں بدل دیں گے کہ عذاب کا مزہ لیں بے شک اللہ غالب حکمت والا ہے'(3)۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ ''جیسے ہی ان کے جسموں کی کھال جل جائے گی'' کیونکہ جلنا تو تھوڑا بھی ہوسکتا ہے۔ بلکہ فرمایا'' جیسے ہی ان کے جسموں کی کھال گل جائے گی'' یعنی جب درد کو محسوس کرنیوالے اعصاب اور رگیں جل جائیں گی تو تب اللہ تعالیٰ ان کی جگہ تازہ رگوں والی جلد پہنا دے گا کہ جس سے ان کو درد کی تکلیف کا احساس مسلسل ہوتا رہے۔

امام ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ''ایک ایک کافر کی سو سو کھالیں ہوں گی۔ ہر ہر کھال پر قسم قسم کے علیحدہ علیحدہ عذاب ہوتے ہوں گے۔ ایک ایک دن میں ستر ہزار مرتبہ کھال الٹ پلٹ ہوگی یعنی کہہ دیا جائے گا کہ پھر لوٹ آئے وہ پھر لوٹ آئے گی... حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بھی کہتے ہیں کہ ایک ایک ساعت میں سو سو بار بدلی جائے گی۔(4)

پروفیسر ٹیجاٹا ٹیجاسین (Tegata Tejasen.Professor Dr) جو تھائی

لینڈ کی "چیانگ مائی یونیورسٹی" کے شعبہ علم تشریح الاعضا (Anatomy) کے چیئرمین ہیں، نے جلد میں پائے جانے والے پین ریسیپٹرز پر تحقیق میں بہت وقت صرف کیا ہے۔ شروع میں وہ اس بات پر یقین نہیں رکھتے تھے کہ قرآن نے اس جیسی سائنسی حقیقت کو 1400 سال پہلے بیان کیا ہوگا۔ بعد ازاں انہوں نے قرآن مجید کی اس خاص آیت کے معانی پر تحقیق و جستجو کی۔ اس تحقیق کے نتیجے میں پروفیسر ٹیجا ٹا، قرآن مجید کی اس سائنسی مطابقت پر اس قدر متاثر ہوئے کہ سعودی عرب کے شہر ریاض میں "قرآن و سنت میں سائنسی نشانیاں" کے موضوع پر ہونے والی آٹھویں سعودی میڈیکل کانفرنس میں حاضرین کے سامنے بڑے فخر سے کلمہ طیبہ پڑھنے کا اعلان کر دیا۔ (5)

طب جدید نے دریافت کیا ہے کہ وہ اعصاب جو درد کا ادراک کرتے ہیں خواہ وہ درد چوٹ لگنے، جلنے یا شدید گرمی و سردی کی وجہ سے ہو وہ اعصاب فقط جلد میں ہی پائے جاتے ہیں، یعنی اگر جسم میں سوئی چبھوئی جائے تو درد صرف جلد پر ہوگا لیکن اگر سوئی جلد سے آگے گزار دی جائے تو بقیہ گوشت میں فی الواقع درد نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جہنم میں دوزخیوں کی جلد جلنے کے بعد اس کو تبدیل کرتا رہے گا تاکہ ان کو جلنے کا عذاب برابر ہوتا رہے۔

چنانچہ جدید سائنس نے جس حقیقت کو حال ہی میں دریافت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو 1400 سال پہلے ہی قرآن مجید میں ذکر کر کے اپنے رب العالمین کے ہونے کا ثبوت منکرین اور مفکرین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اور اب بھی اگر کوئی قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا کلام نہ مانے تو وہ اپنی بدقسمتی و بدبختی کا ماتم کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہدایت کے منکر کو ہدایت نہیں دیتا۔

حواشی:

(1)۔ ہماری جلد، اردو سائنس بورڈ لاہور سے اقتباس.
htm•www.nmsl.chem.ccu.edu.tw/tea/SKIN_910721//:http
(2)۔ www.islamicmedicine.org/medmiraclesofquran/medmiracleseng.htm#pain//:http
(3)۔ النساء، 56:4 (4)۔ تفسیر ابن کثیر۔ جلد اول۔ صفحہ 568 (5)۔ بحوالہ، قرآن اینڈ ماڈرن سائنس، صفحہ 64 سائنسی انکشافات قرآن و حدیث کی روشنی میں، صفحہ 174-176

انسان کی مرحلہ وار تخلیق

اور جدید سائنس کے اعترافات

قرآن مجید میں رحم مادر کے اندر انسانی وجود کی تشکیل اور اس کے ارتقاء کے مختلف مرحلے بیان کیے گئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ رب کائنات کا نظام ربوبیت اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ بطن مادر کے اندر بھی جلوہ فرما ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچے کی زندگی کے نقطہء آغاز سے لے کر اس کی تکمیل اور تولد کے وقت تک پرورش کا ربانی نظام انسان کو مختلف تدریجی اور ارتقائی مرحلوں میں سے گزار کر یہ ثابت کر دیتا ہے کہ انسانی وجود کی داخلی کائنات ہو یا عالم ہست و بود کی خارجی کائنات ، ہر جگہ ایک ہی نظام ربوبیت یکساں شان اور نظم واصول کے ساتھ کارفرما ہے۔ قرآن مجید کے بیان کردہ ارتقاء کے مراحل کی تصدیق بھی آج جدید سائنسی تحقیق کے ذریعے ہو چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انسان کی تخلیق اور پیدائش کے ان مراحل کو سورۃ المومنون میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ق ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ط فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ

"اور بیشک ہم نے آدمی کو چنی ہوئی مٹی سے بنایا، پھر اسے پانی کی بوند کیا ایک مضبوط ٹھہراؤ میں پھر ہم نے اس پانی کی بوند کو خون کی پھٹک کیا پھر خون کی پھٹک کو گوشت کی بوٹی پھر گوشت کی بوٹی کو ہڈیاں پھر ان ہڈیوں پر گوشت پہنایا پھر اسے اور صورت میں اٹھان دی تو بڑی برکت والا ہے اللہ سب سے بہتر بنانے والا ہے'(المومنون،14)

ان آیات میں انسانی تشکیل و ارتقاء کے سات مراحل کا ذکر ہے جن میں سے پہلے کا تعلق اس کی کیمیائی تشکیل سے ہے اور بقیہ چھ کا اس کے بطن مادر کے تشکیلی مراحل سے۔ مذکورہ بالا آیات میں بیان کردہ انسانی ارتقاء کے مراحل کی ترتیب اس طرح بنتی ہے۔ سللة من طین،نطفہ،علقہ،مضغہ

،عظام،لحم اور خلق آخر۔آیئے اب ہم ان مراحل کا اسی ترتیب کے ساتھ تفصیلاً مطالعہ کرتے ہیں پہلا مرحلہ:
اور ہم نے انسان کو مٹی کے سَت سے پیدا کیا۔

مٹی سے پیدا کرنے کا مطلب یا تو یہ ہے کہ ہر انسان ان ماڈوں سے پیدا کیا جاتا ہے جو سب کے سب زمین سے حاصل ہوتے ہیں اور اس تخلیق کی ابتدا نطفے سے ہوتی ہے یا یہ کہ نوعِ انسانی کا آغاز آدم علیہ السلام سے کیا گیا جو براہِ راست مٹی سے بنائے گئے تھے اور پھر آگے نسلِ انسانی کا سلسلہ نطفے سے چلا جیسا کہ سورۃ سجدہ میں فرمایا"انسان کی تخلیق مٹی سے شروع کی اور پھر اس کی نسل ایک سَت سے چلائی جو حقیر پانی کی شکل میں نکلتا ہے"۔

عربی کے لفظ سُللٰہ کا معنی ہے جوہر،ست،خلاصہ یا کسی چیز کا بہترین حصہ۔اس بات کا بھی علم ہمیں حال ہی میں ہوا ہے کہ کسی انڈے کے اندر داخل ہونے والا منی کا ایک معمولی سا قطرہ یا جرثومہ ہی اسے بارآور بنانے کے لیے کافی ہے۔حالانکہ ایک مرد کئی کروڑ جرثومے پیدا کرتا ہے۔قرآن مجید نے اس بات کی کہ "کروڑوں جرثوموں میں سے ایک جرثومہ"کی نشاندہی لفظ سُللٰہ سے کی ہے۔اسی طرح اس بات کو بھی ہم نے حال ہی میں معلوم کیا ہے کہ عورت کے رحم کے اندر بننے والے لاکھوں انڈوں میں سے صرف ایک انڈہ ہی بارآور ہوتا ہے(ہر بالغ عورت کے مخصوص حصے میں 4 لاکھ ناپختہ انڈے موجود رہتے ہیں مگر ان میں سے صرف ایک انڈہ پختہ ہو کر اپنے مقررہ وقت پر نمودار ہوتا ہے)۔چنانچہ اس بات کو بھی لفظ سُللٰہ ہی سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی لاکھوں انڈوں میں سے ایک ہی انڈے کا بارآور ہونا۔

انسان کی پیشانی

ابوجہل اسلام کا دشمن تھا، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچانے کے لیے ہر وقت موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس کے متعلق قرآن مجید میں فرماتا ہے:

كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ﴿١٥﴾ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿١٦﴾ فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ﴿١٧﴾ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴿١٨﴾

ہاں ہاں اگر باز نہ آیا تو ضرور ہم پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچیں گے، کیسی پیشانی جھوٹی خطا کار اب پکارے اپنی مجلس کو، ابھی ہم سپاہیوں کو بلاتے ہیں (سورۃ العلق)

اس آیت میں پیشانی کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے اس کی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے۔ جدید طبی تحقیق نے مندرجہ بالا آیت کریمہ میں موجود ایک ایسے نکتے کی طرف نشاندہی کی ہے کہ جس کے متعلق ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ آج میڈیکل سائنس نے ہمیں یہ معلومات فراہم کی ہیں کہ انسان کے دماغ کا اگلا حصّہ جسے Prefrontal Area کہتے ہیں، سامنے والے حصے (پیشانی) میں واقع ہے اور جو کسی اچھے یا برے کام کے کرنے کے بارے میں سوچ بچار اور تحریک پیدا کرتا ہے اور یہی حصّہ انسان کے سچ یا جھوٹ بولنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔(2)

ایک اور کتاب میں انسانی دماغ کے متعلق لکھا ہے کہ:

''اسباب، دوراندیشی کے متعلق منصوبے اور حرکت کی طرف پیش قدمی سر کے سامنے والے حصے پیشانی میں وقوع پذیر ہوتے ہیں جس کو (Prefrontal Area) کہتے ہیں''۔(3)

پروفیسر ڈاکٹر کیتھ مور کے مطابق سائنس دان سر کے سامنے والے حصہ پیشانی کے اس فریضہ منصبی کو پچھلے ساٹھ سالوں کے دوران دریافت کر پائے ہیں۔(4)

مندرجہ بالا آیت کریمہ میں چونکہ ذکر ابوجہل کا آیا ہے لہٰذا اسی وجہ سے یہاں پیشانی کو سخت خطا کار اور جھوٹا ہی کہا گیا۔ انسائیکلوپیڈیا آف بریٹانیکا کے مطابق جدید تحقیق نے دریافت کیا ہے کہ اگر دماغ کا یہ حصہ کسی وجہ سے ناکارہ ہو جائے تو وہ انسان اخلاقی پستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس حصے میں نقص واقع ہونے سے انسان برے کاموں کے متعلق سوچنا شروع کر دیتا ہے اور آخر کار وہ اپنے مسائل کو حل کرنے میں بھی ناکام ہو جاتا ہے۔

جھوٹ کی شروعات اسی حصے (Frontal Lobes) کے مرکز سے ہوتی ہے۔دماغ کا یہی حصہ جھوٹ بولنے پر اکساتا ہے اوراس پر عمل کروانے کے لیے جسم کے دوسرے حصوں کو ہدایات بھی دیتا ہے۔

دماغ کو تین طرح کی جھلیوں نے گھیرا ہوا ہے۔ان میں ایک Cerebral Spinal (CSFFluid)) ہے۔جس کا کام دماغ کی حفاظت کرنا،غذا مہیا کرنا،اور ٹھنڈا رکھنا ہے۔جدید طبی تحقیق کے مطابق کھوپڑی کے اندر دماغ کا وزن 50 گرام ہوتا ہے جب کہ کل کھوپڑی کا وزن تقریباً1700 گرام ہوتا ہے۔

یونانی مفکر ارسطو کا خیال تھا کہ انسان کے خیال کا مرکز دل میں پنہاں ہوتا ہے،لیکن اب سائنس دانوں نے ارسطو کے اس خیال کو بالکل مسترد کر دیا ہے۔دماغ ایک پیچیدہ مشین ہے،جس میں کروڑوں خلیے ہیں۔ممتاز ماہر نفسیات ولیم جیمز نے 1910ء میں کہا تھا کہ تمام لوگ اپنی تمام تر دماغی قوتوں کا بہت کم حصہ استعمال میں لاتے ہیں کیونکہ ان کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ دماغ کی کتنی قوتیں ہیں اور انہیں کس طرح استعمال میں لانا ہے۔سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ یہ بات عیاں ہے کہ ہر انسان دماغ کا دس فی صد حصہ استعمال کرتا ہے۔باقی حصوں کے بارے میں لاعلمی کی وجہ سے وہ استعمال کرنے کے قابل نہیں ہے۔

ماہرین یہ بات بھی معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ دماغ کے حجم اور ذہانت کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ برطانیہ کے ایک سائنس دان کا کہنا ہے کہ انسانی دماغ کو میکینیکل واٹر کلاک بھی کہا جا سکتا ہے۔اسے ہائیڈرو پمپ (Hydro Pump) بھی کہا جا سکتا ہے۔ٹیلی فون سوئچ بورڈ بھی کہا جا سکتا ہے اور سپر کمپیوٹر بھی کہا جا سکتا ہے۔

کھوپڑی کے اندر انسانی دماغ دو نیم کروں پر مشتمل ایسے اعصابی نظام کا مجموعہ ہے جسے کائنات میں جسم اور ماحول کے مابین حسی اور حرکی واسطے کی سب سے پیچیدہ ساخت کا غیر معمولی قدرتی کمپیوٹر خیال کیا جاتا ہے۔دیکھنے میں وہ ایک بھورے رنگ کا بڑا سا اخروٹ دکھائی دیتا ہے۔ اس کی بیرونی پرت قشر دماغ کہلاتی ہے،جو دوسری ساختوں کو گھیرے ہوتی ہے۔قشر دماغ اس کے کل حجم کا اسی فی صد ہوتا ہے اور ارتقائی لحاظ سے یہ ایک جدید ترین ساخت ہے۔قشر دماغ (Cerebral Cortey)ان تمام ذہنی افعال اور سرگرمیوں کا ذمہ دار ہوتا ہے جنہیں ہم ادراک وفہم کہتے ہیں۔

قشر دماغ کو قشر کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس کی مماثلت درخت کی بھوری چھال جیسی ہوتی ہے۔ نیز یہ بھی کرہ دماغ میں اسی طرح اطراف پر لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ انسانی دماغ کی اساسی اکائی دوسرے جانداروں کے دماغ کی طرح اعصابی خلیے (Neurons) ہیں۔ یہ اعصابی خلیے اپنے تمام اشارے اپنے محوریوں (Axons) کے ذریعے بھیجتے ہیں۔ اس کے دس کھرب ٹریلین خلیے ہیں جن میں ایک سو ارب اعصابی خلیے ہیں جو ایک دوسرے سے اتصالی مقامات پر ملے ہوئے باہم تعلق قائم رکھتے ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے تخلیقی اپج شعور اور حافظہ اعلیٰ انسانی صفات پیدا کرتا ہے۔ آسان الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ دماغ کے اکثر حصے مخصوص افعال سرانجام دیتے ہیں جس کے لیے وہ پہلے سوچتا سمجھتا اور پھر حرکات میں ڈھالتا ہے۔ ☆☆☆☆

انسانی فکر و عمل میں

قلب کا بنیادی کردار اور اسلام

"قلب" انسانی جسم کا اہم اور کلیدی عضو ہے جو جسم انسانی کی طرح فکر و عمل میں بھی بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔اس لیے قرآن وحدیث کی نظر میں قلب کی درستی پر انسانی عمل کی درستی کا انحصار ہے۔قرآن وحدیث میں انسانی دل کو ذہانت کا منبع اور جذبات اور احساسات رکھنے والا عضو قرار دیا گیا ہے۔اس دور میں سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی،اس لیے انیسویں صدی تک یہی سمجھا جاتا رہا کہ انسانی دل کی حیثیت صرف پمپ جیسی ہے جو پورے جسم میں خون پمپ کرتا ہے۔تاہم بیسویں صدی کے وسط میں سائنس نے پہلی مرتبہ یہ حیرت انگیز دریافت کی کہ انسانی دل میں بھی انسانی دماغ کی طرح کے ذہانت کے خلیے پائے جاتے ہیں۔اس انقلابی دریافت کے بعد پھر انسانی دل پر بحیثیت منبع ذہانت (Source of Intelligence) کے مغرب میں بھی کئی اہم سائنسی تحقیقات ہوئیں۔ان تحقیقات کو اس بحث میں مختصراً پیش کیا جائے گا تاکہ ہمیں اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ سائنس آج ان حقائق کو دریافت کر رہی ہے جو قرآن وحدیث نے 1400 سال پہلے بیان کر دیے تھے۔

انسانی دل کے اندر چھوٹا سا دماغ

جدید سائنسی تحقیق

انیسویں صدی حتیٰ کہ بیسویں صدی کے نصف تک سائنس دانوں کے حلقوں میں انسانی دل کو صرف خون پمپ کرنے والا ایک عضو ہی سمجھا جاتا تھا۔لیکن پھر کچھ مزید سائنسی تحقیقات ہوئیں تو سائنس، دل کے متعلق اس بات کو سمجھنا شروع ہوئی جو قرآن نے اور آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو سال پہلے کہی تھی۔جیسا کہ تفسیر قرآن کے ماہر صحابیٔ رسول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا"اس قرآن میں ایسی آیات ہیں جنہیں صرف وقت گزرنے کے ساتھ ہی سمجھا جا سکے گا۔یعنی جیسے جیسے سائنسی علوم ترقی کریں گے"۔

انسانی دل کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا کہ جدید سائنس نے انسانی دل کے متعلق اب یہ سمجھنا شروع کیا ہے کہ اس میں بھی ذہانت کے خانے ہیں۔انسانی دل پر جدید تحقیقات کی بنیاد پر کینیڈا کے سائنس دان ڈاکٹر جے اینڈریو آرمر (Armour M.D)(Andrew. J.Dr, p h . D)نے ایک نئی میڈیکل فیلڈ کی بنیاد رکھی ہے جس کا نام ہے نیورو کارڈیالوجی (Neuroradiology) یعنی انسانی دل کا اعصابی نظام (Nervous System)۔ڈاکٹر آرمر نے دل کے اعصابی نظام کے لیے"دل کے اندر چھوٹا سا دماغ" (A little Brain in the Heart)کی اصطلاح وضع کی ہے۔

یہ اس لیے کہ انہوں نے دریافت کیا ہے کہ انسانی دل کے اندر تقریباً چالیس ہزار اعصابی خلیے (Nerve Cells) پائے جاتے ہیں۔یہ وہی خلیے ہیں جن سے دماغ بنتا ہے۔یہ اتنی بڑی تعداد ہے کہ دماغ کے کئی چھوٹے حصے اتنے ہی اعصابی خلیوں سے مل کر بنتے ہیں۔مزید برآں دل کے یہ خلیے دماغ کی مدد کے بغیر کام کر سکتے ہیں۔دل کے اندر پایا جانے والا یہ دماغ پورے جسم سے معلومات لیتا ہے اور پھر موزوں فیصلے کرنے کے بعد جسم کے اعضاء حتیٰ کہ دماغ کو بھی جوابی ہدایات دیتا ہے۔

علاوہ ازیں دل کے اندر موجود دماغ میں ایک طرح کی یاداشت (Short Term Memory) کی صلاحیت بھی پائی جاتی ہے۔دل کو دھڑکنے کے لیے دماغ کی ضرورت نہیں ہوتی

،یہی وجہ ہے کہ دل کی پیوند کاری کے آپریشن میں دل اور دماغ کے درمیان تمام رابطے کاٹ دیے جاتے ہیں اور جب دل نئے مریض کے سینے میں لگایا جاتا ہے تو وہ پھر سے دھڑکنا شروع کر دیتا ہے ۔ان تمام تحقیقات کو پیش کرنے کے بعد، جو ڈاکٹر اینڈریو آرمر اور ان کے معاون سائنس دانوں نے دل کے اعصابی نظام پر کی ہیں، ڈاکٹر آرمر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :

انسانی پنجر اور ہڈیوں کی ساخت

انسانی پنجر اور ہڈیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن مجید کی درج ذیل آیات میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے:

وَانظُرْ اِلَی الْعِظَامِ کَیفَ نُنشِزُھَا ثُمَّ نَکْسُوھَا لَحْمًا

اور ان ہڈیوں کو دیکھ کیونکر ہم انہیں اٹھان دیتے پھر انہیں گوشت پہناتے ہیں.(1)

ایک دوسرے مقام پر اس طرح ارشاد ہوتا ہے:

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلاً وَّنَسِیَ خَلْقَه ط قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَھِیَ رَمِیْم۔ قُلْ یُحْیِیْھَا الَّذِیْ اَنْشَاَھَآ اَوَّلَ مَرَّۃٍ ط وَھُوَ بِکُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمُ۔ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ

اور کیا آدمی نے نہ دیکھا کہ ہم نے اسے پانی کی بوند سے بنایا جبھی وہ صریح جھگڑالو ہے، اور ہمارے لئے کہاوت کہتا ہے اور اپنی پیدائش بھول گیا، بولا ایسا کون ہے کہ ہڈیوں کو زندہ کرے جب وہ بالکل گل گئیں ۔تم فرماؤ انھیں وہ زندہ کرے گا جس نے پہلی بار انہیں بنایا اور اسے ہر پیدائش کا علم ہے جس نے تمہارے لئے ہرے پیڑ میں سے آگ پیدا کی جبھی تم اس سے سلگاتے ہو۔(2)

پنجر صناعی کی ایک بہترین مثال ہے ۔ یہ انسانی جسم کو ساختیاتی سہارا دینے کا نظام ہے ۔ یہ جسم کے نازک اعضا مثلاً دماغ ، دل اور پھیپھڑوں کی حفاظت کرتا ہے اور اندرونی اعضا کو تحفظ دیتا ہے ۔ یہ انسانی جسم کو حرکت کی ایک ایسی اعلیٰ صلاحیت دیتا ہے جو کسی مصنوعی میکانیکی عمل سے فراہم کی ہی نہیں جا سکتی ۔ ہڈی کے ٹشو غیر نامیاتی (بے روح) نہیں ہیں جیسا کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں ۔ ہڈی کا ٹشو تو جسم کے لیے معدنیاتی ذخیرہ ہوتا ہے جس میں کئی اہم معدنیات شامل ہوتی ہیں مثلاً کیلشیم اور فاسفیٹ جسم کی ضرورت کے مطابق یہ یا تو ان معدنیات کو ذخیرہ کر لیتا ہے یا انہیں جسم کو دے دیتا ہے ۔اس سب کے علاوہ ہڈیاں خون کے سرخ خلیے بھی پیدا کرتی ہیں ۔

پنجر کے یکساں طور پر بہترین طریقے سے کام کرنے کے علاوہ وہ ہڈیاں جو اسے بناتی ہیں ان کی بھی ایک منفرد ساخت ہوتی ہے۔ان کے ذمے یہ کام ہوتا ہے کہ یہ جسم کو سہارا دیں اور اس کی حفاظت کریں۔اور اس کام کو بہتر طور پر سرانجام دینے کے لیے ہڈیوں کو ایسی صلاحیت اور قوت کے ساتھ تخلیق کیا جاتا ہے۔بدترین حالات کو بھی اس موقع پر سامنے رکھا جاتا ہے۔مثال کے طور پر ران کی ہڈی اس وقت ایک ٹن وزن اٹھا سکتی ہے جب یہ بالکل سیدھی کھڑی ہو۔ہمیں حیرت ہوگی کہ ہمارے ہر قدم کے بعد جو ہم اٹھاتے ہیں یہ ہڈی ہمارے جسم کے وزن سے تین گنا زیادہ وزن اٹھا لیتی ہے۔جب ایک کھلاڑی اونچی چھلانگ لگاتا اور زمین پر آ گرتا ہے تو اس کے پیڑو (Pelvis) کے ہر مربع سینٹی میٹر پر 1400 کلو گرام دباؤ پڑتا ہے۔یہ ڈھانچہ مضبوط کس طرح بنتا ہے جو خود ایک واحد خلیے کی تقسیم اور اسے بار بار دہرانے سے وجود میں آتا ہے؟ اس سوال کا جواب ہڈیوں کی بے مثال تخلیق میں پوشیدہ ہے۔

اس موضوع کی مزید وضاحت میں آج کی ٹیکنالوجی سے دی جانے والی ایک مثال مددگار ثابت ہوگی۔وسیع اور کھلی بلند و بالا عمارتوں کی تعمیر میں مچان بندی (Scaffolding) کا نظام استعمال کیا جاتا ہے۔اس تکنیک میں تعمیر کے لیے جو سہارا فراہم کرنے والا ساز و سامان استعمال کیا جاتا ہے اس میں پتھر کا ڈھانچہ شامل نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی ایسی سلاخیں ہوتی ہیں جن سے یہ مچان بنائی جاتی ہے۔پیچیدہ حساب کتاب اور پیمائشوں کے ذریعے جن میں کمپیوٹر کی مدد بھی لی جاتی ہے زیادہ مضبوط اور لاگت کی نسبت سے مفید اور سودمند پل اور صنعتی تعمیرات کھڑی کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔

ہڈیوں کا اندرونی ڈھانچہ بھی مچان کے اس نظام کی مانند ہوتا ہے جسے ان پلوں اور میناروں یا ٹاوروں کو تعمیر کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ان میں صرف ایک فرق ہے کہ ہڈیوں کا یہ نظام انسان کے بنائے ہوئے نظام کی نسبت زیادہ پیچیدہ، جامع اور اعلیٰ ہوتا ہے۔اس نظام کی مدد سے ہڈیاں زیادہ مضبوط اور ہلکی ہوتی ہیں جنہیں انسان آرام کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا، یعنی اگر ہڈیوں کا اندر کا حصہ زیادہ سخت اور ابھرا ہوا ہوتا جس طرح ان کا بیرونی حصہ ہوتا ہے تو انسان ان کو اٹھا ہی نہ سکتا اور اپنی سخت بناوٹ کی وجہ سے یہ ہڈیاں معمولی سی چوٹ پڑنے پر ٹوٹ جاتیں یا ان میں دراڑیں پڑ جاتیں۔

ہماری ہڈیوں کا نہایت جامع نظام ہمیں سادہ طریقے سے زندگی گزارنے، بغیر کسی درد اور تکلیف کے مشکل کام بھی سرانجام دینے میں مدد دیتا ہے۔ ہڈیوں کی ایک اور خاصیت یہ ہے کہ جسم کے مختلف حصوں میں یہ بہت لچکدار رکھی گئی ہیں۔ جس طرح پسلیوں کا پنجر جسم کے بہت نازک اعضا کو تحفظ دیتا ہے جن میں دل اور پھیپھڑے زیادہ قابل ذکر ہیں۔ یہ پھیپھڑوں کو پھیلنے اور سکڑنے میں مدد دیتا ہے تا کہ ہوا کا پھیپھڑوں کے اندر آنا جانا لگا رہے۔

ہڈیوں کی یہ لچک وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوسکتی ہے۔ مثال کے طور پر حمل کے آخری مہینوں میں عورتوں کی کولہے کی ہڈیاں پھیل کر ایک دوسرے سے دور ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک بے حد اہم ذکر ہے کیونکہ بچے کی پیدائش کے دوران یہ پھیلاؤ اس کے سر کو رحم مادر سے کچلے جانے سے محفوظ رہ کر باہر آنے میں مدد دیتا ہے۔

ہڈیوں کے بارے میں یہ معجزانہ باتیں یہاں تک ہی محدود نہیں ہیں ان کی لچک ،پائیداری، ہلکے پن کے علاوہ ان ہڈیوں میں اپنے آپ کو مرمت کر لینے کی بھی صلاحیت ہوتی ہے۔ اگر ایک ہڈی ٹوٹ جائے تو ضرورت صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ اسے اپنی جگہ پر مضبوط رکھا جائے تا کہ اسے اپنے آپ کو مرمت کر لینے کا موقع مل سکے۔ جیسا کہ یہ بات واضح ہے کہ جسم میں جو مختلف عوامل کارفرما ہوتے ہیں ان میں سے یہ بھی ایک نہایت پیچیدہ عمل ہوتا ہے جس میں کئی ملین خلیے باہم مل جل کر کام کرتے ہیں۔

پنجر کی خودحرکتی صلاحیت ایک اور اہم بات ہے جس میں غور کیا جانا چاہیے۔ ہمارے ہر قدم کے ساتھ وہ مہرے جو ریڑھ کی ہڈی کو تشکیل دیتے ہیں ایک دوسرے پر حرکت کرتے ہیں۔ اس مسلسل حرکت اور رگڑ سے عام حالت میں ان مہروں کو گھس جانا چاہیے تھا۔ مگر ان کو اس سے بچانے کے لیے ہر مہرے کے درمیان مزاحمتی مرمری ہڈیاں رکھ دی گئی ہیں جن کو ڈسک کہتے ہیں۔ یہ پلیٹ نما ڈسک انہیں جھٹکوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ ہر قدم پر زمین سے جسم پر ایک قوت روبہ عمل ہوتی ہے جو جسم کے وزن کا ردعمل ہوتا ہے۔

ریڑھ کی ہڈی میں موجود مزاحمتی مرمری ہڈیاں اور قوت تقسیم کرنے والی اس کی خمدار شکل جسم کو جھٹکوں سے نقصان نہیں پہنچنے دیتی۔ اگر یہ لچک دار خاص ساخت جو ردعمل کی قوت کو کم کرتی ہے، نہ ہوتی تو خارج ہونے والی قوت براہ راست کھوپڑی کو منتقل ہو جاتی اور ریڑھ کی ہڈی کا سب سے اوپر والا

سرا اسے توڑ کر دماغ میں گھس جاتا۔

ہڈیوں کے جوڑوں کی سطح پر تخلیق کے نشانات بھی نظر آتے ہیں۔ یہ جوڑ حالانکہ عمر بھر مسلسل حرکت میں رہتے ہیں مگر ان کو پھر بھی کسی چکنائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ماہرین حیاتیات نے اس کا سبب جاننے کے لیے تحقیق کی کہ ان جوڑوں میں رگڑ کیوں کر نہیں ہوتی، یہ کیسے اس سے محفوظ رہتے ہیں؟ سائنس دانوں نے دیکھا کہ یہ مسئلہ ایک ایسے نظام سے حل کر دیا گیا تھا جسے "تخلیق کا مکمل معجزہ" تصور کیا جانا چاہیے۔ جوڑوں کی جو سطح رگڑ والی سمت میں ہوتی ہے اس پر ایک پتلی مسام دار چپنی ہڈی کی تہہ رکھ کر اسے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ اس تہہ کے نیچے ایک چکناہٹ ہوتی ہے۔ جب بھی ہڈی جوڑ پر زور ڈالتی ہے تو یہ چکناہٹ مساموں سے باہر نکل آتی ہے اور جوڑ کی سطح پر اسی قسم کی پھسلن پیدا ہو جاتی ہے جیسی تیل سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ساری باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ انسانی جسم ایک جامع اور بے نقص بناوٹ کے ساتھ انسانی جسم کے ساتھ بہ سہولت حرکت کر سکتا ہے۔

ذرا یہ تصور کریں کہ اگر ہر شے اس قدر جامع اور بے نقص نہ ہوتی اور پوری ٹانگ میں ایک ہی لمبی سی ہڈی ہوتی تو انسان کے لیے چلنا ایک سنگین مسئلہ بن جاتا۔ ہمارے جسم بڑے بھدے اور سست ہوتے، تمام پھرتی ختم ہوگئی ہوتی۔ بیٹھنا تک مشکل ہو جاتا اور ہر ایسے کام میں ٹانگ پر جب دباؤ پڑتا تو وہ بہت جلد ٹوٹ جاتی۔ تاہم انسانی پنجر کی ساخت اس قسم کی ہے جو جسم کو ہر طرح کی حرکت کی اجازت دیتی ہے۔(3)

حواشی

(1)۔ البقرہ:259

(2)۔ یٰس:77-79

(3)۔ اللہ کی نشانیاں، عقل والوں کے لیے۔ صفحہ 82-86

خنزیر (سؤر) کی حرمت کے سائنسی دلائل

قرآن میں تقریباً 4 مقامات پر سؤر کا گوشت کھانے سے منع فرمایا گیا ہے۔ یہ ممانعت ان آیات: 173 / 3,2 / 145,5 / 6 ,اور 115 / 16 میں آئی ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

قُل لاَّ أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّماً عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلاَّ أَن يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَماً مَّسْفُوحاً أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقاً أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّهِ بِهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلاَ عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ

تم فرماؤ میں نہیں پاتا اس میں جو میری طرف وحی ہوئی کسی کھانے والے پر کوئی کھانا حرام مگر یہ کہ مُردار ہو یا رگوں کا بہتا خون یا بد جانور کا گوشت وہ نجاست ہے یا وہ بے حکمی کا جانور جس کے ذبح میں غیر خدا کا نام پکارا گیا تو جو ناچار ہوا نہ یوں کہ آپ خواہش کرے اور نہ یوں کہ ضرورت سے بڑھے تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورہ انعام 145)

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالْدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلاَّ مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَن تَسْتَقْسِمُواْ بِالأَزْلاَمِ ذَلِكُمْ فِسْقٌ ط﴾

تم پر حرام ہے مُردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جس کے ذبح میں غیر خدا کا نام پکارا گیا اور وہ جو گلہ گھونٹنے سے مرے اور بے دھار کی چیز سے مارا ہوا اور جو گر کر مرا اور جسے کسی جانور نے سینگ مارا اور جسے کوئی درندہ کھا گیا مگر جنہیں تم ذبح کرلو اور جو کسی تھان پر ذبح کیا گیا اور پانسے ڈال کر بانٹا کرنا یہ گناہ کا کام ہے"۔ (سورۃ المائدۃ۔ 3)

نبی رحمت ﷺ نے بھی کئی احادیث میں سؤر کے حرام ہونے کا امت کو بتایا ہے۔ اور اس کو بیچنا بھی حرام قرار دے دیا ہے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی بھی ہے کہ قیامت کے قریب جب حضرت عیسیٰ آسمان سے نازل ہوں گے تو صلیب توڑنے کے ساتھ ساتھ خنزیر کو بھی قتل کریں گے۔ (متفق علیہ)۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت میں سؤر کس قدر ناپسندیدہ جانور ہے۔ یہ

آیات اور احادیث مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مسلمان اس جانور سے صدیوں سے نفرت کرتے چلے آرہے ہیں ۔مگر مقام افسوس ہے کہ بائبل کے منع کرنے کے باوجود یہودی اور عیسائی اس غلیظ جانور سے محبت کرتے اور اس کا گوشت ان کی مرغوب غذا ہے ۔آیئے دیکھتے ہیں کہ بائبل نے اس جانور کے متعلق اپنے متبعین کو کیا ہدایات دی تھیں ۔بائبل کے عہد نامہ عتیق کی کتاب احبار میں لکھا ہے: "اور سؤر نہ کھانا کیونکہ اس کے پاؤں الگ اور چرے ہوئے ہیں، ہر چند وہ جگالی نہیں کرتا، وہ تمہارے لیے ناپاک ہے ۔تم ان کا گوشت نہ کھانا اور ان کی لاشوں کو بھی نہ چھونا، وہ تمہارے لیے ناپاک ہیں"۔

(احبار: 8-7/11)۔کتاب استثناء میں لکھا ہے: "اور سؤر تمہارے واسطے اس لیے ناپاک ہے کہ اس کے پاؤں تو چرے ہوتے ہیں مگر وہ جگالی نہیں کرتا ۔تم ان کا گوشت نہ کھانا نہ ان کی لاش کو چھونا"۔(استثناء:8/14)۔اسی طرح بائبل کی کتاب یسعیاہ باب 65 فقرہ 2 تا 5 میں بھی سؤر کا گوشت کھانے کی ممانعت ہے۔

تاہم دوسرے غیر مسلم اور دہریے قرآن مجید اور فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی وقت کان دھریں گے کہ جب ان کو دلائل عقلی اور سائنس کی بنیاد پر سمجھایا جائے کہ سؤر کا گوشت مختلف قسم کی کم از کم 70 بیماریوں کا باعث بنتا ہے ۔اسے کھانے والے کے معدے اور آنتوں میں کئی قسم کے کیڑے پیدا ہوسکتے ہیں ۔مثلاً Trichinella Spiralis , پن ورم، ہک ورم اور Taenia Solium وغیرہ ۔اور بعض کے اندر ایسے بہت سے مراض ہوتے ہیں جو انسان کے درمیان مشترک ہوتے ہیں جیسے (فاشیولا) کیڑے کے اندر انفلوئنزا کے جراثیم ہوتے ہیں، اسی طرح Ascaris اور پیٹ کے سانپ Fasciolopsis Buski, چین میں بہت زیادہ ہوتے ہیں ۔اور خنزیر پالنے والوں اور ان سے میل جول رکھنے والوں کے اندر Balantidiasis کا مرض وبائی شکل میں ظاہر ہوتا ھے ۔جیسا کہ بحرالکاہل (Pacific Ocean) کے ایک جزیرے میں خنزیر کے پاخانہ کے پھیلنے کے نتیجہ میں ہوا ۔اگرچہ جرمنی، فرانس، فلپائن اور وینزویلا وغیرہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے جدید ٹیکنیکس بروئے کار لا کر خنزیر کے گوشت کی نجاستوں اور خباستوں کو دور کر دیا ہے لیکن ان ممالک کے مخصوص سرٹیفائڈ فارموں کا مذکورہ گوشت کھانے والے بیشمار افراد میں بھی Trichinellosis کا مرض لگ جاتا ہے ۔جس کی وجہ سے معدے سے آواز نکلنے لگتی ہے اور کیڑے

پیدا ہوجاتے ہیں جن کی تعداد کم از کم دس ہزار ہوتی ہے پھر یہ کیڑے خون کے راستہ سے انسان کے پٹھوں میں منتقل ہوجاتے ہیں اور پھر مزید مہلک امراض کی شکل اختیار کر لیتے ہیں ۔اسی طرح Spiralis کا مرض بیمار خنزیر کا گوشت کھانے سے لگتا ہے ۔اس مرض میں بھی انسان کی آنتوں کے اندر کیڑا پروان چڑھنے لگتا ہے جس کی لمبائی کبھی کبھی سات میٹر سے بھی لمبی ہوتی ہے جس کا کانٹے دار سر آنتوں کی دیواروں کے اندر فضلے اور دوران خون کی دشواری کا سبب بنتا ہے اس کی چار چوسنے والی چونچیں اور ایک گردن ہوتی ہے جس سے مزید چونچ دار کیڑے وجود میں آتے ہیں جن کا ایک مستقل وجود ھوتا ہے اور تعداد ہزار تک ہوتی ہے،اور ہر بار ہزار انڈے پیدا ہوتے ہیں اور انڈوں سے ملوث کھانا کھانے کی صورت میں Taenia Solium کا مرض لگ جاتا ہے ۔ٹائینا سولیئم کے انڈے (Ova) خون کی گردش میں شامل ہو کر جسم کے کسی بھی حصے میں پہنچ جاتے ہیں اگر یہ دماغ تک جاپہنچیں تو یاد داشت کو شدید نقصان پہنچاتے ہیں اگر یہ دل میں داخل ہوجائیں تو دل کے دورے کی وجہ بن سکتے ہیں ۔آنکھ میں جاپہنچنے پر نابینا پن ہوسکتا ہے ۔جگر میں داخل ہوجائیں تو پورے جگر کا ستیاناس کر ڈالتے ہیں غرض اس ایک مرض سے جسم کے کم و بیش تمام اعضا غارت ہوسکتے ہیں ۔سور کے گوشت کا کاروبار کرنے والوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ اسے 70 ڈگری پر پکانے سے اس کے بیشتر جراثیم مرجاتے ہیں جو کہ صرف اپنی پراڈکٹس بیچنے کا پراپیگنڈہ ہے ۔

امریکہ میں کی گئی ایک تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اس گوشت کے استعمال سے لگنے والے خطرناک طفیلئے ٹرائی کیورا سے متاثرہ چوبیس افراد میں سے بیس ایسے تھے جنہوں نے 70 ڈگری سے زائد پر پکا ہوا سؤر کا گوشت کھایا تھا اس سے اخذ کیا گیا کہ مخصوص درجہ حرارت پر پکانے سے بھی ایسے جراثیم کسی طور نہیں مرتے ۔اس گوشت کے کھانے والے میں بے غیرتی کے جراثیم بھی داخل ہوجاتے ہیں یعنی اپنی ازدواجی زندگی میں دیگر مرد حضرات کی شراکت اچھی لگنے لگتی ہے یہی وجہ ہے کہ اپنی بیویاں ایک دوسرے سے بدلنے والے سور کے گوشت کے رسیا ہوتے ہیں لہٰذا مسلمان تو مسلمان کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والے یا لادین افراد کو بھی اپنی صحت اور متوازن انسانی طرز زندگی کی خاطر اس کے استعمال سے لازمی بچنا چاہئے ۔علاوہ ازیں سؤر کے گوشت میں عضلات ساز مادہ کم اور حد سے زیادہ چربی ہوتی ہے ۔یہ چربی خون کی نالیوں میں جم جاتی ہے جو فالج اور دل کے دورے کا باعث بنتی ہے ۔یہ کوئی حیران کن بات نہیں کہ 50 فیصد امریکی ہائی بلڈ پریشر کا شکار ہیں ۔

سؤر روئے زمین کا غلیظ ترین جانور ہے۔ یہ گوبر، فضلے اور گندگی پر پھلتا پھولتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے غلاظت خور اور سب سے زیادہ گندگی پر گزار کرنے والا جانور بنایا ہے۔ دیہات میں عموماً لیٹرینز اور بیت الخلا نہیں ہوتے، اس لیے لوگ کھلی جگہوں پر رفع حاجت کرتے ہیں اور اکثر اس غلاظت کو سؤر ہی چٹ کر جاتے ہیں۔ کوئی یہ دلیل دے سکتا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک جیسے آسٹریلیا وغیرہ میں سؤروں کو بڑی صاف ستھری جگہ پالا جاتا ہے۔ ان صاف جگہوں پر بھی ان کو باڑوں میں رکھا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سؤروں کو کتنی ہی صاف ستھری جگہ پر رکھا جائے، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا، یہ فطرتاً گندے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنا بلکہ ساتھ والے کا فضلہ بھی کھا جاتے ہیں۔

خنزیر زمین پر پایا جانے والا سب سے بے شرم جانور ہے۔ یہ واحد جانور ہے کہ جو دیگر سؤروں کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ اس کی ساتھی سؤرنی سے بُرائی کریں۔ امریکہ اور یورپ میں اکثر لوگ اس کا گوشت کھاتے ہیں۔ اسی کا اثر ہے کہ آج اُس معاشرے میں شرم وحیا کا جنازہ نکل چکا ہے۔ بائبل کے منع کرنے کے باوجود یہ سؤروں کو پالتے، ان کا گوشت کھاتے اور اس کے چمڑے وغیرہ سے چیزیں تیار کرتے ہیں۔ مائکروسافٹ اینکارٹا کے مطابق چین میں 46 کروڑ، امریکہ میں 6 کروڑ، برازیل میں 3 کروڑ اور جرمنی میں 6.2 کروڑ سؤر پائے جاتے ہیں۔ یہ وہ ممالک ہیں کہ جہاں سب سے زیادہ سؤر پائے جاتے ہیں۔ مجموعی طور پر تقریباً 94 کروڑ سؤر اس زمین پر پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں سؤر کی کھال (Pigskin) یا چمڑے سے سوٹ کیس، دستانے، بیلٹ اور فٹ بال تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کے سخت بالوں سے برش تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کی چربی سے کئی مصنوعات تیار کی جاتی ہیں جو بیکری اور کھانا بنانے میں استعمال ہوتی ہیں۔

قارئین کرام: آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ قرآن کے سؤر کو حرام قرار دینے میں کتنی مصلحتیں ہیں۔ اللہ اور اس کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات پر ہمارا ایمان پہلے بھی تھا اور آج سائنس کی بدولت اللہ نے ہمیں ان خطرات سے آگاہ بھی فرما دیا ہے کہ جو سؤر کے کھانے سے ہمیں پہنچ سکتے تھے۔ یقینا ہمارا رب، اس کا پیغمبر، ہادی و رہبر جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم، اور اس کی لاریب کتاب قرا ن حکیم، سب سچے اور ہدایت و رہنمائی کا واحد ذریعہ ہیں

زمین کامرکز گرینچ یا مکہ المکرمہ

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۹۶﴾

بے شک سب میں پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کو مقرر ہوا وہ ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور سارے جہان کا راہنما[1]

صاحب معارف القرآن اس آیت شریفہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "آیت کے الفاظ کا خلاصہ یہ ہے کہ سب سے پہلا گھر جو منجانب اللہ لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا ہے وہ ہے جو مکہ میں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں سب سے پہلا عبادت خانہ کعبہ ہے، اس کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ دنیا کے سب گھروں میں پہلا گھر عبادت ہی کے لیے بنایا گیا ہو، اس سے پہلے نہ کوئی عبادت خانہ ہو نہ دولت خانہ ،حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، ان کی شان سے کچھ بعید نہیں کہ انھوں نے زمین پر آنے کے بعد اپنا گھر بنانے سے پہلے اللہ کا گھر یعنی عبادت کی جگہ بنائی ہو، اسی لیے حضرت عبداللہ بن عمر، مجاہد ،قتادہ، سدی وغیرہ صحابہ و تابعین اسی کے قائل ہیں کہ کعبہ دنیا کا سب سے پہلا گھر ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ لوگوں کے رہنے سہنے کے مکانات پہلے بھی بن چکے ہوں مگر عبادت کے لیے یہ پہلا گھر بنا ہو، حضرت علی سے یہی منقول ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ آدم علیہ السلام کی یہ تعمیر کعبہ نوح علیہ السلام کے زمانے تک باقی تھی، طوفان نوح میں منہدم ہوئی اور اس کے نشانات مٹ گئے، اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کیا[2]

سائنسی حقائق یہ بتاتے ہیں کہ مکہ جسے قرآن میں بکہ بھی کہا گیا ہے اور جہاں مسلمان عمرہ وحج ادا کرتے ہیں، زمین پر معرض وجود میں آنے والا خشکی کا پہلا ٹکڑا تھا۔ سائنسی طور پر ثابت شدہ حقیقت یہی ہے کہ زمین کی پیدائش کے ابتدائی ایام میں تمام کرہ زمین پانی میں ڈوبا ہوا تھا یعنی ایک بہت بڑا سمندر تھا۔ بعد ازاں اس کی تہہ سے آتش فشاں پھٹے اور انہوں نے زمینی پرت کے نیچے پگھلے ہوئے چٹانی مواد اور لاوے کو بڑی مقدار میں اوپر دھکیل دیا جس سے ایک پہاڑی معرض وجود میں آئی اور یہی وہ پہاڑی تھی کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنا گھر (قبلہ) بنانے کا حکم دیا۔ مکہ کی سیاہ بالٹ چٹانوں پر کی گئی سائنسی تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ ہماری زمین کے قدیم ترین پتھر ہیں۔

اگر یہ بات ایسے ہی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اسی مکہ سے ہی پھر بقیہ زمین کو پھیلایا گیا اور دنیا کے دوسرے خطے معرض وجود میں آئے۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے اس دعویٰ کی تائید میں کوئی حدیث مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم بھی موجود ہے۔اس کا جواب ہاں میں ہے۔ڈاکٹر ذغلول النجار نے درج ذیل دو احادیث کو پیش کیا ہے [3]۔جن کو میں انہی کے حوالے سے نقل کر رہا ہوں۔کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کعبہ پانی کے اوپر زمین کا ایک ٹکڑا تھا اسی سے ہی بقیہ زمین کو پھیلایا گیا [4]

اسی طرح الطبرانی اور البیہقی نے شعب الایمان میں ابن عمر سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ جب زمین و آسمان بنائے جا رہے تھے تو پانی کی سطح میں سے سب سے پہلا نکلنے والا خشکی کا ٹکڑا یہی تھا کہ جس پر یہ (متبرک گھر) واقع ہے، پھر اسی کے نیچے سے ہی بقیہ زمین کو پھیلایا گیا۔علاوہ ازیں درج ذیل احادیث سے بھی مندرجہ بالا احادیث کو تقویت ملتی ہے۔ امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عباس سے ایک حدیث روایت کی ہے۔اس لمبی حدیث میں سے ایک ٹکڑا میں یہاں نقل کرتا ہوں۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "(مکہ) وہ شہر ہے کہ جس دن سے اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔اسی دن سے اس کو حرمت دی اور اللہ کی یہ حرمت قیامت تک قائم رہے گی۔[5] اس کے علاوہ امام ابن کثیر نے بھی ایک حدیث مسند احمد، ترمذی اور نسائی سے نقل کی ہے، اس کو امام ترمذی نے حسن صحیح کہا ہے کہ نبی ﷺ نے مکہ کے بازار حزورہ میں کھڑے ہو کر فرمایا کہ "اے مکہ تو اللہ تعالی کو ساری زمین سے بہتر اور پیارا ہے۔اگر میں زبردستی تجھ سے نہ نکالا جاتا تو ہرگز تجھے نہ چھوڑتا" [6]

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان جہاں مندرجہ بالا تحقیق کی حمایت کرتا ہے وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو بھی عیاں کرتا ہے۔حضور ﷺ کو کس نے بتایا کہ شروع میں پوری زمین پانی میں ڈوبی ہوئی تھی اور پھر اسی خشکی کے ٹکڑے پر اللہ کا پہلا گھر بنایا گیا تھا، جیسا کہ مکہ کی بسالٹ چٹانوں پر کی گئی تحقیق سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ یہ قدیم ترین چٹانیں ہیں۔

پروفیسر حسین کمال الدین ریاض یونیورسٹی میں شعبہ انجینیرنگ میں پروفیسر تھے۔انہوں نے اپنی بے مثال تحقیق کے بعد اس امر کا انکشاف کیا تھا کہ مکہ زمین کا مرکز ہے۔انہیں اس حقیقت کا علم اس وقت ہوا جب وہ دنیا کے بڑے شہروں سے قبلہ (مکہ) کی سمت معلوم کرنے کے کام پر مامور تھے۔اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ایک چارٹ بنایا۔اس چارٹ میں ساتوں براعظموں کو مکہ المکرمہ سے فاصلے اور محل وقوع کی بنیاد پر ترتیب دیا۔پھر اپنے کام کو مزید آسان بنانے

کے لیے انہوں نے اس چارٹ کو طول بلد اور عرض بلد کے حساب سے تقسیم کرنے کے لیے یکساں خطوط کھینچے ۔پھر ان فاصلوں، مقداروں اور دوسری کئی ضروری چیزوں کو معلوم کرنے کے لیے انہوں نے انتہائی جدید اور پیچیدہ کمپیوٹر سافٹ ویئرز کو استعمال کیا اور آخر کار دو سالہ انتھک محنت کے بعد اپنی نئی دریافت کا انتہائی خوشی سے اعلان کرتے ہوئے کہا کہ "مکہ" ہی زمین کا مرکز ہے۔انہوں نے کہا کہ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک ایسا دائرہ بنایا جائے کہ اگر اس کا مرکز مکہ ہو تو اس دائرے کے بارڈرز تمام براعظموں سے باہر واقع ہوں گے اور اسی طرح اس دائرے کا محیط تمام براعظموں کے محیطوں کا احاطہ کر رہا ہوگا۔[7]

بعد ازاں 20 صدی کی آخری دہائی میں زمین اور زمین کی تہوں کی جغرافیائی خصوصیات کو جاننے اور نقشہ نویسی کی غرض سے حاصل کی گئیں سیٹلائٹ تصاویر سے بھی اس تحقیق کو تقویت ملتی ہے کہ مکہ زمین کے مرکز میں واقع ہے۔سائنسی طور پر یہ امر ثابت شدہ ہے کہ زمین کی پلیٹس (Tectonics Plates) اپنی لمبی جغرافیائی عمر کے وقت سے باقاعدگی کے ساتھ عربین پلیٹ کے گرد گھوم رہی ہیں۔یہ پلیٹیں باقاعدگی کے ساتھ عربین پلیٹ کی طرف اس طرح مرتکز ہو رہی ہیں کہ گویا یہ ان کا مرکز ہدف ہے۔اس سائنسی تحقیق کا مقصد ہرگز یہ معلوم کرنا نہیں تھا کہ زمین کا مرکز مکہ ہے یا نہیں بلکہ کچھ اور مقاصد تھے۔تاہم اس کے باوجود یہ تحقیق مغرب کے کئی سائنسی میگزینوں میں شائع ہوئی مگر اس طور پر کہ اس سے کوئی نتیجہ اخذ نہ کیا جا سکے۔[8]

سید ڈاکٹر عبدالباسط مصر کے نیشنل ریسرچ سنٹر کے ممتاز رکن ہیں۔انہوں نے 16 جنوری 2005ء میں سعودی عرب میں المجد ٹی وی چینل کو انٹرویو دیا تھا۔اس میں مکۃ المکرمہ کے متعلق کئی حیرت انگیز سائنسی انکشافات کیے تھے۔(یہ انٹرویو یوٹیوب پر دستیاب ہے[9]) انہوں نے کہا کہ سائنسی بنیادوں پر مکہ دنیا کا مرکز اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ جب نیل آرم سٹرانگ زمین سے اوپر خلا کی طرف جا رہے تھے تو انہوں نے زمین کی تصویریں کھینچیں۔انہوں نے دیکھا کہ زمین خلا میں معلق ایک کالا ٹکڑا ہے۔نیل آرم سٹرانگ نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ اسے کس نے لٹکایا ہے؟ پھر خود ہی جواب دیا کہ! اسے خدا نے ہی معلق کر کے تھاما ہوا ہے۔علاوہ ازیں انہوں نے مشاہدہ کیا کہ زمین کے کسی خاص مقام سے کچھ خاص قسم کی شعاعیں نکل رہی ہیں جو کم طول موج کی تھیں۔انہوں نے اس چیز کو معلوم کرنے کے لیے اپنے کیمروں کو اس مقام پر فوکس کرنا شروع کیا کہ جہاں سے یہ شعاعیں نکل رہی تھیں۔آخر کار وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئے اور انہوں نے یہ معلوم کر لیا کہ وہ مقام کہ جہاں سے شعاعیں خارج ہو رہی ہیں وہ مکہ ہے۔بلکہ بالکل اگر صحیح طور پر کہا جائے تو وہ کعبہ ہے۔جب نیل آرم

سٹرانگ نے یہ منظر دیکھا تو اس کے منہ سے نکلا۔ اوہ! میرے خدا! جب وہ مریخ کے قریب پہنچے تو دوبارہ انہوں نے زمین کی تصویریں کھینچیں تو انہیں معلوم ہوا کہ مکہ سے نکلنے والی یہ شعاعیں مسلسل آگے جارہی تھیں۔ ناسا نے یہ تمام معلومات اپنی ویب سائٹ پر پیش کر دی تھیں مگر صرف 21 دن کے بعد ان کو ویب سائٹ سے ہٹا دیا گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ یہ معلومات بڑی اہم اور حساس تھیں۔ ڈاکٹر عبدالباسط نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہا کہ یہ شعاعیں جو کعبہ سے خارج ہورہی ہیں لا محدود ہیں۔ زیادہ طول موج یا کم طول موج والی شعاعوں کی خصوصیات سے بالکل برعکس، میرے خیال میں اس کی وجہ فقط یہ ہے کہ ان کا منبع اور ماخذ زمین کا کعبہ ہے جو آسمانی کعبہ سے وابستہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ شعائیں زمینی کعبۃ اللہ سے بیت المعمور (آسمانی کعبۃ اللہ) تک جاتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کعبہ زمین کے اس مقام پر ہے کہ جہاں زمینی مقناطیسی قوتوں کا اثر صفر ہے۔ یہ زمینی مقناطیس کے شمالی اور جنوبی قطبوں کے بالکل درمیان میں ہے، اگر یہاں قطب نما رکھ دیا جائے تو اس کی سوئی حرکت نہیں کرے گی۔ اس لیے کہ اس مقام پر شمالی قطب اور جنوبی قطب کی کششیں ایک دوسرے کے اثر کو زائل کر دیتی ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مکۃ المکرمہ اس زمینی مقناطیسی قوت کے اثر سے باہر ہے اور مکہ کے رہنے والوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، نتیجتاً جو کوئی مکہ کی طرف سفر کرتا ہے یا اس میں رہتا ہے وہ صحت منداور لمبی عمر پاتا ہے۔ اسی طرح جب آپ کعبہ کا طواف کرتے ہیں تو آپ اپنے اندر ایک توانائی داخل ہوتے ہوئے محسوس کرتے ہیں ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ آپ زمین کے مقناطیسی میدان کی قوت کے اثر سے باہر ہوتے ہیں اور سائنسی بنیادوں پر یہ بات ثابت شدہ ہے۔ علاوہ ازیں مکہ کی کالی بسالٹ چٹانوں کے ٹکڑوں کو لیبارٹری میں لے جا کر چیک کیا گیا ہے اور یہ بات معلوم کر لی گئی ہے کہ یہ زمین کی سب سے قدیم ترین چٹانیں ہیں۔ علاوہ ازیں برطانیہ کے عجائب گھر میں حجر اسود کے تین ٹکڑے موجود ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ یہ جس چٹان کے ٹکڑے ہیں اس کا ہمارے نظام شمسی میں وجود نہیں پایا جاتا۔

مصر کے ڈاکٹر عبدالباسط کی گفتگو سے ثابت ہوتا ہے کہ کعبہ نا صرف زمین کا مرکز ہے بلکہ یہ پوری کائنات کا مرکز بھی ہے کیونکہ اس کی سیدھ میں بالکل اوپر آسمانی کعبہ یعنی بیت المعمور ہے۔ مختلف روایات واحادیث سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بیت المعمور، زمینی کعبہ کی سیدھ میں بالکل اوپر ہے۔ اگر وہ اوندھے منہ گرے تو سیدھا اس کے اوپر گرے۔ ہر روز 70 ہزار فرشتے اس میں آتے ہیں جب وہ وہاں سے جاتے ہیں تو پھر ان کی باری نہیں آتی۔ علاوہ ازیں قرآن مجید میں بھی مکہ کو ''ام القری'' کہا گیا ہے جس کا مطلب ہے کہ مکہ ان شہروں کی ماں ہے جو سب اس کے ارد گرد ہیں۔ اس

آیت سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکہ تمام شہروں کے درمیان میں ہے۔ اسلامی معاشرے میں ماں کے لفظ کی ایک خاص اہمیت ہے۔ آل و اولاد کا سلسلہ ماں سے ہی چلتا ہے۔ چنانچہ مکہ کو شہروں کی ماں کا نام دینے سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ زمین کے بقیہ حصے بھی اسی سے پھیلے یا اس کے بعد وجود میں آئے اور یہی بات سائنسی طور پر بھی ثابت ہو چکی ہے۔

مکہ ایک محفوظ اور پر امن شہر ہے۔ قرآن میں اس کو "بلد الامین" بھی کہا گیا ہے۔ یہاں کسی چرند پرند کو بھی نقصان پہنچانا ممنوع ہے۔ یہ تمام اطراف سے اونچے پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں کبھی کبھار کم درجے کے زلزلے ہی آتے ہیں۔ مزید برآں چونکہ اس شہر کا درجہ حرارت عموماً زیادہ رہتا ہے اسی وجہ سے یہاں زمینی پرت (Crust) کے نیچے چٹانیں چپکنے والی اور لیس دار ہیں، اس وجہ سے بھی مستقبل میں اگر کبھی یہاں زلزلہ آیا تو اس کی شدت کم ہی رہے گی۔

کعبہ کی ایک اور اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ مسلمان اس کے گرد طواف کرتے ہیں۔ طواف کا آغاز حجر اسود والی جگہ سے کیا جاتا ہے۔ حاجی یہ طواف اینٹی کلاک وائز (مخالف گھڑی وار) کرتا ہے اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس کائنات میں ایٹم سے لے کر کہکشاؤں تک ہر چیز اینٹی کلاک وائز حرکت کر رہی ہے۔ ایٹم کے اندر الیکٹرونز، نیوکلس کے گرد اینٹی کلاک وائز گردش کرتے ہیں۔ زمین کی تمام پلیٹیں عربین پلیٹ کے گرد اینٹی کلاک وائز حرکت کرتی ہیں۔ انسانی جسم کے اندر سائیٹو پلازم، سیل کے نیوکلس کے گرد اینٹی کلاک وائز حرکت کرتا ہے۔ پروٹین مالیکیولز بھی بائیں سے دائیں طرف اینٹی کلاک وائز ہی حرکت کرتے ہوئے ترتیب پاتے ہیں۔ ماں کے رحم کے اندر بیضیٰ انثیٰ بھی اپنے ہی گرد حرکت اینٹی کلاک وائز ہی کرتا ہے۔ مرد کی منی کے اندر جرثومہ بھی اپنے ہی گرد اینٹی کلاک وائز حرکت کرتے ہوئے بیضیٰ انثیٰ تک پہنچتا ہے۔ انسانی خون کی گردش بھی اینٹی کلاک وائز ہی شروع ہوتی ہے۔ زمین اپنے گرد اور سورج کے گرد بھی اینٹی کلاک وائز ہی حرکت کرتی ہے۔ سورج اپنے ہی گرد اینٹی کرتا ہے۔ کہکشاں خود اپنے ہی گرد اینٹی کلاک وائز گردش کرتی ہے۔ [10]

چنانچہ ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان جب کعبہ کا طواف کرتا ہے تو وہ اسی طرح اپنے رب کی طرف سے عائد کی گئی ڈیوٹی کو نبھاتا ہے کہ جس طرح ایٹم سے لے کر کہکشاؤں تک، سب اپنے رب کے حکم کے آگے سر اطاعت خم کیے ہوئے ایک ہی سمت میں محو گردش ہیں۔ اس سے اسلام کا امتیاز اور برتری دوسرے مذاہب کی نسبت نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔

بی بی سی اردو ڈاٹ کام کے مطابق پچھلے سال قطر میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی، جس کا

عنوان ''مکہ مرکز عالم،علم وعمل'' تھا۔اس میں کچھ مسلمان علمائے دین اور سائنسدانوں نے مطالبہ کیا تھا کہ گرینچ کے معیاری وقت کے بجائے مکہ مکرمہ کے وقت کو معیار کے طور پر اپنانا چاہیے کیونکہ بقول ان کے مکہ مکرمہ ہی دنیا کا مرکز ہے۔اس کانفرنس میں شریک ایک ماہر ارضیات کا کہنا تھا کہ جغرافیائی لحاظ سے مکہ مکرمہ قطب شمالی سے دیگر طول بلد کے مقابلے میں بہترین مطابقت رکھتا ہے۔شرکاء کانفرنس کا کہنا تھا کہ انگریزوں نے برطانوی راج کے دور میں دیگر مما لک پر قبضہ کر کے،باقی دنیا پر زبردستی گرینچ کا وقت مسلط کر دیا تھا۔اب اس صورت حال کو بدلنے کا وقت آ گیا ہے۔معروف عالم دین شیخ یوسف القرضاوی نے اس کانفرنس میں کہا کہ جدید سائنسی طریقوں سے اب یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ مکہ مکرمہ کرہ ارض کا اصل مرکز ہے۔جس سے قبلے کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے۔اس کانفرنس میں مکہ واچ، نامی منصوبے کا بھی جائزہ لیا گیا۔یہ ایک فرانسیسی سائنسدان کی ایجاد کردہ گھڑی ہے جو الٹی طرف چلتی ہے اور اس سے دنیا میں کہیں بھی موجود مسلمانوں کو قبلے کے رخ کا پتہ چل سکتا ہے۔(بی بی سی اردو ڈاٹ کام،22اپریل،2008)[11]

اب جب کہ سائنسی تحقیقات اور سیٹلائٹ تصاویر نے بھی اس تحقیق کی حمایت کر دی ہے کہ مکہ ہی زمین کا مرکز ہے تو کئی دہائیوں سے جاری اس تنازعہ اور بحث ومباحثہ کو ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بین الاقوامی طور پر وقت کے معیار کے لیے گرینچ کی بجائے ''مکہ ''ہی کو مرکز قرار دیا جائے۔اب اگر مکہ کے وقت کو بین الاقوامی طور پر نافذ کر دیا جائے تو ہر ایک کے لیے نمازوں کے اوقات کا معلوم کرنا بالکل آسان ہو جائے گا۔لہذا مکۃ المکرمہ جو کہ ایک مبارک شہر ہے،کو دنیا کے دیگر شہروں پر فضیلت کا حق ملنا چاہیے۔

______

[1] (آل عمران:96)[2] (تفسیر معارف القرآن،سورۃ آل عمران96)

[3] www.elnaggarzr.com/Test_fre/English/index_E.asp//:http

[4] (الفائق فی غریب الحدیث للزمخشری:1/371)[5] (بخاری ابواب العمرہ،باب لایحل القتال بمکۃ)[6]۔(تفسیر ابن کثیر، آل عمران، آیت96)

[7] (المجلہ العربی۔نمبر 237،اگست 1978ء)

ww.quran-m.com/firas

en1/index.php?option=com/

-mekka-is-the-center-of:content&view=article&id=94

historical&Itemid=90:the-universe&catid=61

www.youtube.com/watch?v=HSal6QvX2SI//:http[9]

www.quran-m.com/firas[10]
en1/index.php?option=com/
mekka-is-the-center-of-the-u:content&view=article&id=94
:historical&Itemid=90tp:niverse&catid=61
printable/080/04/www.bbc.co.uk/urdu/regional/story/2008//
macca_mean_time_zs.shtml421

ٹیلی پورٹیشن اور تخت بلقیس

دور جدید میں جب سائنسی ترقی بلندیوں کو چھو رہی ہے، سائنس دانوں نے سفر کے ذرائع کو تیز کرنے کے بجائے ایسی جہت میں تجربات شروع کر دیے ہیں جس کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنے کے لیے خواہ کوئی بھی ذریعہ استعمال کیا جائے ان سب میں ایک نقص مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمیں طبعی طور پر فاصلہ ضرور طے کرنا پڑتا ہے جو چند منٹوں سے لے کر کئی گھنٹوں پر محیط ہو سکتا ہے لیکن اب سائنس دانوں نے ایسے ذرائع ایجاد کرنے پر توجہ مرکوز کر دی ہے جس کے تحت آپ کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانے کے لیے کار، ہوائی جہاز، راکٹ یا کسی اور سواری کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اس ضمن میں ٹیلی کمیونیکیشن اور ٹرانسپورٹیشن کی خصوصیت کے باہمی امتزاج سے ایک نیا نظام ٹیلی پورٹیشن وضع کرنے کی سمت میں تجربات کیے جا رہے ہیں۔ سائنس دانوں نے ابتدائی طور پر فوٹان پر تجربات کیے ہیں جو کامیابی سے ہمکنار ہوئے ہیں۔

ٹیلی پورٹیشن کیا ہے؟

ٹیلی پورٹیشن سے مراد کسی بھی مادی چیز کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر اس طرح منتقل کرنا ہے جس کے ذریعے یہ چیز پہلے مقام سے غائب ہو جاتی ہے۔ دوسرے معنوں میں یہ اس مقام سے فنا ہو جاتی ہے اور دوسرے مقام پر اس کا ظہور ہوتا ہے۔ ٹیلی پورٹیشن کے ذریعے منتقل کی جانے والی چیز کی صحیح ترین ایٹمی معلومات ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کی جاتی ہیں جہاں یہ یکجا ہو کر ہو بہو وہی چیز تشکیل دے دیتی ہیں جو روانگی کے مقام پر فنا ہو چکی ہوتی ہے۔ اس طرح سفر کے دوران

فضا اور وقت دونوں ہی آڑے نہیں آتے۔سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ انسانوں کو بھی پلک جھپکتے ہی کسی بھی مقام پر منتقل کیا جاسکے گا۔مسافت خواہ ایک فٹ سے لے کر ایک میل تک کی کیوں نہ ہو،مسافر کو کوئی فاصلہ طے کرنا نہیں پڑے گا۔

ٹیلی پورٹیشن کا نظریہ سب سے پہلے 1966ء سے 1969ء تک ٹی وی پر دکھائی جانے والی سیریل اسٹار ٹیک میں پیش کیا گیا تھا۔اس سیریل کا مرکزی خیال جین راڈن بیری کی لکھی ہوئی کہانیوں پر مبنی تھا جس میں خلائی جہاز کی مختلف مہمات دکھائی جاتی تھیں،اسے ناظرین نے نہ صرف پسند کیا بلکہ اس پر انتہائی حیرت کا بھی اظہار کیا تھا۔اس سیریل میں کیپٹن کرک،اسپاک اور ڈاکٹر میکائے اپنے دیگر ساتھیوں سمیت اپنے خلائی جہاز سے کسی بھی سیارے پر اتر جاتے تھے اور یہ فاصلہ سیکنڈوں میں طے ہوتا تھا۔

1993ء میں ٹیلی پورٹیشن کا نظریہ سائنسی تصورات کی حدوں سے نکل کر اس وقت حقیقت کی دنیا میں داخل ہوگیا جب ماہر طبیعیات چارلس بینٹ اور ان کے ساتھی محققین نے اس امر کی تصدیق کی کہ کوانٹم ٹیلی پورٹیشن ممکن ہے تاہم اسے عملی جامہ اسی صورت پہنایا جاسکتا ہے جب اصل شے جسے ایک مقام سے دوسرے مقام تک آن واحد میں منتقل کیا جانا ہے،تباہ کردی جائے۔چارلس بینٹ نے اس امر کا اعلان مارچ 1993ء میں امریکی فزیکل سوسائٹی کے سالانہ اجلاس میں کیا جس کے بعد 29 مارچ 1993ء کو فزیکل ریویو لیٹرز میں بینٹ کے اعلان پر ایک رپورٹ بھی شائع ہوئی۔اس وقت سے سائنس دانوں نے فوٹانز پر تجربات کرنا شروع کیے اور یہ بات ثابت کی کہ کوانٹم ٹیلی پورٹیشن حقیقت میں ممکن ہے۔

1998ء میں کیلیفورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے ماہرین طبیعیات نے یورپی ماہرین کے ساتھ تجربات کیے اور فوٹانز کو کامیابی کے ساتھ ٹیلی پورٹیشن کے عمل سے گزارا۔واضح رہے کہ فوٹان روشنی کا انتہائی چھوٹا ذرہ ہے جس میں توانائی موجود ہوتی ہے۔سائنس دانوں کی اس ٹیم نے فوٹان کی ایٹمی ساخت کا کامیابی سے مطالعہ کیا اور اس ساخت کے بارے میں تمام معلومات ایک میٹر کی دوری تک تار کے ذریعے روانہ کیں اور فوٹان کی ایک نقل پیدا ہوئی تاہم اصل فوٹان اب باقی نہیں رہا تھا بلکہ اس کی جگہ پر اس کی ہوبہو نقل نے لے لی تھی۔

انسانی ٹیلی پورٹیشن

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ اسٹار ٹریک میں ٹیلی پورٹیشن کے لیے استعمال کیے جانے والے "ٹرانسپورٹر روم" جیسی مشین کی تشکیل میں فی الحال کئی برس لگ سکتے ہیں۔اس مشین کے ذریعے ہمارے جسم میں پائے جانے والے 1000 مہا سنکھ(یعنی ایک کے آگے مزید 28 صفر کا اضافہ کیا جائے)ایٹم ایک مقام سے دوسرے مقام پر اس انداز میں منتقل ہوسکیں گے کہ کسی ایٹم کی جسم میں جگہ تبدیل نہ ہو۔اس مشین کے ذریعے ایٹموں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے ساتھ ساتھ ان ایٹموں میں پائی جانے والی خصوصی اطلاعات و معلومات بھی روانہ کرنا پڑیں گی اور مطلوبہ مقام پر یہ تمام ایٹم ہوبہو اسی انداز میں یکجا ہوجائیں گے جس انداز میں یہ اصل جسم میں موجود تھے،ان میں ذرہ برابر تبدیلی جسمانی ساخت میں تغیر کا سبب بن سکتی ہے۔

اگر ٹیلی پورٹیشن کے لیے مذکورہ مشین یعنی ٹرانسپورٹر تیار کرلی گئی تو ٹیلی پورٹیشن کا عمل کامیابی سے ہمکنار ہوسکے گا تاہم سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ اس عمل کی وضاحت ہم اس طرح کرسکتے ہیں کہ ٹیلی پورٹیشن میں جینیاتی کلوننگ اور ڈیجیٹلائزیشن دونوں مل کر کام کریں گے لہٰذا سے بائیو ڈیجیٹل کلوننگ کہنا بے جا نہیں ہوگا۔ٹیلی پورٹیشن کے عمل سے گزرنے والا شخص روانگی کے مقام پر درحقیقت مر جائے گا اور مطلوبہ منزل پر اس کی ہوبہو نقل وجود میں آجائے گی جس میں اس کی تمام حسیات،یادداشت، جذبات اور خواب وامیدیں سب کچھ اس ہوبہو نقل میں موجود ہوں گی چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ٹیلی پورٹر اپنی منزل پر زندہ پہنچے گا لیکن یہ اس کا حقیقی جسم نہیں ہوگا۔سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ اس کی مثال بالکل فیکس جیسی ہے جس میں ایک مقام سے کسی دستاویز کی نقل ارسال کی جاتی ہے۔اور دور دراز مقام پر اس کی ہوبہو نقل موصول ہوجاتی ہے۔یہ شبیہہ بالکل اصل کے مطابق ہوتی ہے تاہم اصل نہیں ہوتی۔اسی طرح ٹیلی پورٹیشن کے بعد منزل پر پہنچنے والا انسان فیکس کے مقابلے میں زیادہ حقیقی ہوگا تاہم اصل نہیں ہوگا۔

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ جس طرح دور جدید میں مختلف قسم کی ٹیکنالوجیز شارع ترقی پر گامزن ہیں اسی طرح ٹیلی پورٹیشن میں بھی کامیابیاں حاصل کی جائیں گی اور ایک دن ایسا آئے گا کہ جب سفر کی صعوبتوں سے مکمل طور پر نجات حاصل ہوجائے گی۔مستقبل میں ہماری اولادوں میں سے کوئی بھی کئی سو ارب نوری سالوں کے فاصلے پر موجود کہکشاں کے کسی سیارے پر قائم دفتر میں کام کاج ختم کرنے کے بعد اپنی کلائی پر بندھی گھڑی سے کہے گا کہ میں زمین پر اپنے گھر میں رات کے کھانے کے لیے

پہنچنا چاہتا ہوں ۔اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ابھی مکمل نہیں ہو پائیں گے کہ وہ شخص کھربوں میل دور اپنی مطلوبہ منزل پر موجود ہوگا۔(1)

قرآن مجید میں ٹیلی پورٹیشن کا ذکر موجود ہے!

جی ہاں! آپ یہ جان کر یقینا حیران ہوں گے کہ قرآن مجید میں 1400 سال پہلے ہی سے اس کا ذکر موجود ہے جسے انسان موجودہ جدید دور سے قبل صرف معجزہ سمجھ کر صرفِ نظر کرتا رہا مگر حقیقت میں یہ ٹیلی پورٹیشن کی ایک بہترین مثال تھی جس کو اللہ تعالیٰ اپنے ایک نیک بندے کے ذریعے ظہور میں لایا تھا۔قرآن مجید میں اس کا ذکر ہمیں سورۃ النمل میں حضرت سلیمان کے اس واقعہ میں ملتا ہے کہ جب آپ ملکہ سبا کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ملکہ سبا کا وہی تخت ،جس کے متعلق ہدہد نے کہا تھا کہ وہ بڑا عظیم الشان ہے،ملکہ کے پہنچنے سے قبل ہی اپنے پاس منگوا لیں ۔ چونکہ جن آپ کے تابع فرمان تھے اور وہ یہ کام کر سکتے تھے،اس سے سیدنا سلیمان کا مقصد یہ تھا کہ تبلیغ کے ساتھ ساتھ ملکہ کو کوئی ایسی نشانی بھی دکھا دی جائے جس سے ملکہ پر پوری طرح واضح ہو جائے کہ وہ محض ایک دنیادار فرمانروا نہیں بلکہ اللہ نے انہیں بہت بڑی بڑی نعمتوں اور فضیلتوں سے بھی نوازا ہے اور آپ اللہ کے نبی بھی ہیں ۔ چنانچہ انہوں نے اپنے درباریوں سے پوچھا:

(قَالَ يٰاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۔ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ج وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ۔ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ط فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ قف لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ط)

''سلیمان نے کہا'' اے اہل دربار،تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں؟ جنوں میں سے ایک قوی ہیکل نے عرض کیا میں اسے حاضر کردوں گا قبل اس کے آپ اپنی جگہ سے اُٹھیں ۔میں اس کی طاقت رکھتا ہوں اور امانت دار ہوں''۔جس شخص کے پاس کتاب کا ایک علم تھا وہ بولا ''میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں''۔جونہی سلیمان نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا' وہ پکار اُٹھا'' یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافر نعمت بن جاتا ہوں۔''(2)

مودودی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ:

''اب رہی یہ بات کہ ڈیڑھ ہزار میل سے ایک تختِ شاہی پلک جھپکتے کس طرح اُٹھ کر آگیا ،تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ زمان ومکان اور مادّہ وحرکت کے جو تصورات ہم نے اپنے تجربات ومشاہدات کی بنا پر قائم کیے ہیں ان کے جملہ حدود صرف ہم ہی پر منطبق ہوتے ہیں ۔خدا کے لیے نہ تو یہ تصورات صحیح ہیں اور نہ وہ ان حدود سے محدود ہے ۔اس کی قدرت ایک معمولی تخت تو درکنار،سورج اور اس سے بھی زیادہ بڑے سیاروں کو آن کی آن میں لاکھوں میل کا فاصلہ طے کرا سکتی ہے ۔جس خدا کے صرف ایک حکم سے یہ عظیم کائنات وجود میں آگئی ہے اس کا ایک ادنیٰ اشارہ ہی ملکہء سبا کے تخت کو روشنی کی رفتار سے چلا دینے کے لیے کافی تھا۔آخر اسی قرآن میں یہ ذکر بھی تو موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک رات اپنے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے بیت المقدس لے بھی گیا اور واپس بھی لے آیا''۔(3)

صاحب تیسیر القرآن بھی اسی آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''ایسے واقعات اگرچہ خرق عادت ہیں تاہم موجودہ علوم نے ایسی باتوں کو بہت حد تک قریب الفہم بنا دیا ہے ۔مثلاً یہی زمین جس پر ہم آباد ہیں سورج کے گرد سال بھر چکر کاٹتی ہے اور اس کی رفتار تقریباً ایک لاکھ سات ہزار کلو میٹر (چھیاسٹھ ہزار چھ سو میل) فی گھنٹہ بنتی ہے ۔حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس قدر عظیم الجثہ کرہ زمین برق رفتاری کے ساتھ چکر کاٹ رہا ہے اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا اور یہ ایسی بات ہے کہ ہم ایمان کی حد تک یقین رکھتے ہیں ۔اب اس زمین کی جسامت اور وزن کے مقابلہ میں ملکہ بلقیس کے تخت کی جسامت اور وزن دیکھئے اور مآرب سے یروشلم کا صرف ڈیرھ ہزار میل فاصلہ ذہن میں لا کر غور فرمائیے کہ اگر پہلی بات ممکن ہے تو دوسری کیوں ممکن نہیں ہوسکتی اور یہ تو ظاہر ہے کہ جو شخص چشم زدن میں تخت لایا تھا تو وہاں بھی اللہ ہی کی قدرت کام کر رہی تھی ۔یہ اس شخص کا کوئی ذاتی کمال نہ تھا اور نہ ہی تخت ظاہری اسباب کے ذریعہ وہاں لایا گیا تھا''۔(4)

بہرحال مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ جدید سائنس کی بدولت ہم قرآن مجید میں بیان کردہ کئی ایسی باتوں اور واقعات کو ماضی کی نسبت موجود دور میں زیادہ بہتر انداز میں سمجھنے کی پوزیشن میں آگئے ہیں اور ہر آن وقت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی بے مثال حکمت وکاریگری اظہر من الشمس ہوتی جارہی ہے۔

حواشی (1)۔ روزنامہ اردو نیوز جدہ،14 اپریل

10/6/physicsweb.org/articles/news/8//:2005http

html.24/08/2004/radio.weblogs.com/0105910//:http

(2)النمل27:38-40(3)۔تفہیم القرآن،جلدسوم،صفحہ 577-578(4)۔تفسیر تیسیر القرآن،جلدسوم،صفحہ 388

پرندوں کی پرواز یا اڑان

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ پرندوں کی پرواز کے متعلق درج ذیل آیت کریمہ میں ارشاد فرماتا ہے:

(اَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ ط مَا یُمْسِکُھُنَّ اِلَّا اللّٰہُ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ)

کیا انہوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ آسمانی فضا میں کیسے مسخر ہیں، انہیں اللہ ہی تھامے ہوئے ہے، جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں (1)

کوئی چیز فضا میں ٹھہر نہیں سکتی، وہ ہوا کی لطافت اور زمین کی کشش ثقل کی وجہ سے زمین پر آ گرتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے پرندوں کے پروں اور ان کی دم کی ساخت میں کچھ ایسا توازن قائم کیا ہے کہ نہ زمین کی کشش ثقل انہیں اپنی طرف کھینچتی ہے اور نہ ہوا کی لطافت انہیں نیچے گراتی ہے اور فضا میں بے تکلف تیرتے پھرتے ہیں۔ پھر یہ فن انہیں سیکھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ سب باتیں ان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہیں۔ پرندے جب اڑنے لگتے ہیں تو اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتے اور پھیلاتے ہیں۔ پھر جب فضا میں پہنچ جاتے ہیں تو ضروری نہیں کہ وہ ہر وقت پروں کو پھیلائے رکھیں۔ وہ انہیں بند بھی کر لیتے ہیں لیکن پھر بھی گرتے نہیں۔ انسان نے پرندوں کی اڑان اور ان کی ساخت میں غور و فکر کر کے ہوائی جہاز تو ایجاد کر لیا۔ مگر جس ہستی نے ایسے طبعی قوانین بنا دیے ہیں جن کی بنا پر پرندے یا ہوائی جہاز فضا میں اڑتے پھرتے ہیں۔ اس ہستی کی معرفت حاصل کرنے کے لیے انسان نے کوئی کوشش نہ کی۔(2)

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

(اَوَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ فَوۡقَهُمۡ صٰٓفّٰتٍ وَّیَقۡبِضۡنَ ط مَا یُمۡسِکُهُنَّ اِلَّا الرَّحۡمٰنُ ط اِنَّهٗ بِکُلِّ شَیۡءٍۢ م بَصِیۡرٌ)

کیا انہوں نے اپنے اوپر پرندوں کو نہیں دیکھا کہ وہ کیسے اپنے پر کھولتے اور بند کر لیتے ہیں۔رحمن کے سوا کوئی نہیں ہے جو انہیں تھامے رکھے،وہ یقیناہر چیز کو دیکھ رہا ہے(3)

صٰفّٰت،صفّ یعنی صف بنانا،سیدھی قطار بنانااور صف بمعنی ہر شے کی سیدھی قطاراور صف الطیر بمعنی پرندوں نے اپنی اڑان میں اپنے پروں کو قطار کی طرح سیدھا کر دیا۔نیز اس کا معنی پرندوں کا اپنے پروں کو ہوا میں پھیلا دینااور بالکل بے حرکت بنا دینا بھی ہے۔جبکہ سب ایک ہی حالت میں ہوں۔مطلب یہ ہے کہ پرندے ہوا میں اڑتے ہوئے کبھی اپنے پر پھیلا بھی دیتے ہیں اور کبھی سکیڑ بھی لیتے ہیں(4)

جدید سائنسی اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ کچھ خاص قسم کے پرندوں کی اڑان ان کے اندر موجود کسی نظام کے تحت ہوتی ہے اور اسی فطری نظام کے تحت پرندے انتہائی لمبے سفر انتہائی کامیابی سے طے کرتے ہیں اور پھر واپس اپنی روانگی کی جگہ پر کامیابی سے پہنچ بھی جاتے ہیں۔پروفیسر ہمبر گر نے اپنی کتاب 'پاور اینڈ فریکیلٹی'' میں گوشت والے پرندوں کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ پرندے بحرالکاہل کے پاس رہتے ہیں اور 24000 کلومیٹر سے زیادہ کا سفر اختیار کرتے ہیں اور اڑتے ہوئے یہ'8' کے ہندسے کی شکل میں اجتماعی سفر کرتے ہیں۔اور یہ سفر چھ ماہ سے زاید عرصے میں طے کرتے ہیں اور پھر زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ کی تاخیر سے یہ واپس اپنی روانگی کی جگہ پر بھی پہنچ جاتے ہیں۔اس لمبے سفر کے لیے انتہائی پیچیدہ ہدایات یقیناپرندے کے اعصابی خلیوں میں موجود ہوتی ہیں۔تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پرندے کے اندر یہ حساس نظام پیدا کرنے والا کون ہے؟ قرآن فرماتا ہے کہ وہ رب العالمین ہے۔(5)

وسطی ایشیا کے مما لک سائبیریااور روس سے بھی نایاب آبی پرندے ہر سال موسم سرما میں پاکستان کی پسماندہ ترین تحصیل نور پورتھل کی یونین کونسل رنگپور کارخ کرتے ہیں اور یہاں چشمہ جہلم لنک کینال سے رسنے والے پانی سے بننے والے جوہڑوں میں ڈیرے جما لیتے ہیں۔ان نایاب پرندوں میں مرغابیاں،گڈول،میلڈ،سرخاب،کوک،بٹیر،تلور،باز،باری،چرخ،چپکی،نیل،سر،بھٹڑ اور دوسرے ان گنت نایاب پرندے شامل ہیں۔یہ نایاب پرندے موسم گرما کے شروع ہوتے ہی ماہ اپریل میں

واپسی کا سفر شروع کر دیتے ہیں۔(6)

پرندے ترکِ وطن کے لیے وقت کا انتخاب کس طرح کرتے ہیں

یہ موضوع ایک عرصے سے غور و فکر کرنے والوں کے لیے دلچسپی کا باعث بنا ہوا ہے کہ پرندوں نے ترک وطن کا آغاز کیسے کیا تھا۔ اور یہ فیصلہ انہوں نے کیوں کر کیا ہوگا۔ کچھ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ایسا موسمی تبدیلیوں کی وجہ سے ہوا۔ جبکہ دوسروں کے خیال میں یہ تلاش خوراک کی وجہ سے ہوا۔ مگر سب سے زیادہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ پرندے جن کو کوئی تحفظ حاصل نہیں ہوتا۔ ان کے جسموں میں کوئی ٹیکنیکل مشینری فٹ نہیں ہوتی، وہ خطرات کی زد میں رہتے ہیں مگر صرف جسموں کو لے کر اتنے طویل سفر طے کر لیتے ہیں۔ ترک وطن کے لیے کچھ مہارت اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً سمت کا تعین کر لیا جائے، خوراک کا ذخیرہ کر لیا جائے اور طویل مدت کے لیے اڑ کر جانے کی صلاحیت ہو۔ جس جانور میں یہ صفات نہ ہوں وہ نقل مکانی نہیں کرے گا۔

اس مسئلہ پر توجہ دینے کے لیے ایک تجربہ کیا گیا جو یہ تھا:

سبزہ زاروں میں رہنے والی بلبلوں کو تجربے کے لیے ایک ایسی لیبارٹری میں لایا گیا تھا جہاں کا درجہ حرارت اور روشنی مختلف تھی۔ اندر کی فضا کو باہر کی فضا سے مختلف رکھا گیا تھا۔ مثال کے طور پر اگر تجربہ گاہ سے باہر موسم سرما تھا تو اندر بہار کی آب و ہوا پیدا کر لی گئی تھی۔ اور پرندوں نے بھی اپنے جسموں کو اندر کے ماحول کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ پرندوں نے چربی کو ذخیرہ کر لیا تھا تاکہ بعد میں خوراک کے طور پر استعمال کی جا سکے جیسا کہ وہ اس وقت کرتے ہیں جب ترکِ وطن کا زمانہ آتا ہے۔ بے شک پرندوں نے مصنوعی آب و ہوا کے مطابق خود کو ڈھال لیا تھا اور تیار تھے کہ جیسے ترکِ وطن کرنے والے ہوں مگر نقل مکانی کا وقت آنے سے پہلے وہ سفر پر روانہ نہ ہوئے تھے۔ انہوں نے باہر کے موسم کا جائزہ لے لیا تھا اور قبل از وقت نقل مکانی نہیں کی تھی۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ پرندے ترکِ وطن کے لیے موسمی حالات پر انحصار نہیں کرتے۔

تو پھر پرندے ترکِ وطن کے لیے وقت کا تعین کیسے کرتے ہیں؟ سائنس دانوں کے پاس ابھی تک اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ان کے خیال میں جانوروں کے جسموں میں 'جسمانی گھڑیاں' فٹ ہیں۔ یہ بند ماحول میں وقت جاننے میں ان کی مدد کرتی ہیں۔ ان سے وہ موسمی تبدیلیوں

میں بھی فرق محسوس کر لیتے ہیں۔ مگر یہ جواب کہ ان کے جسموں میں گھڑیاں فٹ ہوتی ہیں جن سے یہ ترکِ وطن کا وقت معلوم کرتے ہیں بڑا غیر سائنسی جواب ہے۔ یہ کس قسم کی گھڑی ہے اور جسم کے کون سے عضو سے یہ کام کرتی ہے اور یہ وجود میں کیسے آئی؟ اگر یہ گھڑی خراب ہو جائے یا ابھی نہ لگی ہو تو کیا ہو گا؟ یہ سوچتے ہوئے کہ ایسا ہی ایک نظام صرف ترکِ وطن کرنے والے ایک پرندے میں نہیں ہوتا بلکہ تمام نقل مکانی کرنے والے جانوروں میں بھی ہوتا ہے۔ زیادہ اہمیت درج بالا سوالوں کو دی جانی چاہیے۔

جیسا کہ یہ بات مشہور ہے کہ پرندے ایک ہی مقام سے ترکِ وطن نہیں کرتے، اس لیے کہ جب نقل مکانی کا زمانہ آتا ہے تو یہ سب اس وقت ایک ہی مقام پر موجود نہیں ہوتے۔ بہت سی انواع کے یہ پرندے ایک خاص مقام پر پہلے اکٹھے ہوتے ہیں اور پھر وہاں سے مل کر نقل مکانی کرتے ہیں۔ ایسے اوقات کا تعین یہ کیسے کرتے ہیں؟ یہ جسمانی گھڑیاں جو پرندوں کے جسموں میں بتائی جاتی ہیں ان میں اس قدر ہم آہنگی' اور یکسانیت کیسے پائی جاتی ہے؟ کیا ایسا ممکن ہے کہ اس قسم کا منظّم اور جامع و بے نقص نظام کبھی خود بخود اچانک وجود میں آجائے؟

ایک منصوبہ بندی کے تحت عمل میں آنے والا کام بھی اچانک خود بخود وجود میں نہیں آسکتا۔ مزید یہ کہ ان پرندوں اور جانوروں میں کوئی ایسا انتظام نہیں کہ وہ ان جسمانی گھڑیوں سے وقت کا تعین کر لیں۔ کچھ لوگوں کے خیال میں ان گھڑیوں' سے مرادیہ ہے کہ تمام جانوروں پر اللہ کا کنٹرول ہے۔ یہ ترکِ وطن کرنے والے جانور کائنات کی ہر شے کی طرح اللہ کے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں۔

توانائی کا استعمال

پرندے پرواز کے دوران بڑی توانائی استعمال کرتے ہیں۔ انہیں تمام آبی اور خشکی کے جانوروں سے زیادہ ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً اڑ کر 3000 کلومیٹر کا سفر طے کرنے کے لیے جو ہوائی اور الاسکا کے درمیان ہوگا۔ ایک چھوٹا سا پرندہ شکر خورہ (لمبی چونچ والا پھولوں کا رس چوسنے والا) جس کا وزن چند گرام ہوتا ہے، اپنے پروں کو 25 لاکھ مرتبہ پھڑ پھڑاتا ہے۔ اس کے باوجود وہ ہوا میں 36 گھنٹوں تک رہ سکتا ہے۔ اس کی اوسط رفتار اس سفر کے دوران تقریباً 80 کلومیٹر فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ اس طرح کے مشکل سفر میں پرندے کے جسم میں موجود تیزاب کی مقدار بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس سے پرندے کے جسم کا درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کے بے ہوش ہو

جانے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ کچھ پرندے اس خطرے سے بچنے کے لیے زمین پر اتر جاتے ہیں مگر جو پرندے سمندر کے اوپر اڑ رہے ہوں وہ ایسے موقعوں پر کیا کریں گے؟ وہ کیسے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ ماہرین طیور نے تحقیق سے یہ بات معلوم کی ہے کہ ایسے حالات میں یہ پرندے اپنے پر اتنے پھیلا لیتے ہیں جتنے وہ پھیلا سکیں اور اس طرح آرام کر لینے کے بعد اپنے جسموں کو ٹھنڈا کر لیتے ہیں۔

ترکِ وطن کرنے والے پرندے کا تحول (Metabolism) اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ وہ ایسا کام کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر شکر خورے کے جسم میں جو دنیا کا سب سے چھوٹا پرندہ ہے تحول کی کارکردگی ہاتھی کے تحول سے 20 گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اس پرندے کے جسم کا درجہ حرارت 62 سینٹی گریڈ تک چلا جاتا ہے۔

پرواز کے طریقے

اس قسم کی خطرناک اور مشکل پروازوں کو برداشت کرنے کی صلاحیتوں سمیت تخلیق کیے جانے کے علاوہ پرندوں کو ایسی مہارتوں سے بھی نوازا جاتا ہے کہ وہ موافق ہواؤں سے بھی فائدہ اٹھا سکیں۔

مثال کے طور پر سارس یا بگلا 2000 میٹر کی بلندی تک گرم ہوا کی لہروں کے ساتھ اڑتا ہے اور پھر اپنے پر پھڑ پھڑائے بغیر اگلی لہر میں اتر جاتا ہے۔ پرندوں کے غول پرواز کے دوران ایک اور طریقہ استعمال کرتے ہیں جو وی (V) شکل کی پرواز ہوتی ہے۔ اس میں بڑے بڑے مضبوط پرندے مخالف ہوائی لہروں کے مقابلے میں ڈھال بن کر اڑتے ہیں اور یوں کمزور پرندوں کے لیے راستہ بناتے جاتے ہیں۔ ایک ایروناٹیکل انجنیئر Dietrich Hummel نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس طرح کی منظم پرواز کے دوران عموماً غول میں 23٪ کی بچت ہو جاتی ہے۔

بلندی پر پرواز

کچھ ترکِ وطن کرنے والے پرندے بہت بلندی پر اڑتے ہیں۔ مثال کے طور پر مرغابیاں 8000 میٹر کی بلندی پر اڑ سکتی ہیں۔ یہ بلندی ناقابل یقین نظر آتی ہے کیونکہ 5000 میٹر کی بلندی پر سطح سمندر کی نسبت کرہ ہوا 63 فی صد کم کثیف ہوتا ہے۔ ایک ایسی بلندی پر اڑنا جہاں کرہ ہوا اس قدر لطیف ہو پرندے کو اپنے پر زیادہ تیز مارنے پڑتے ہیں اور یوں اسے زیادہ آکسیجن درکار ہوتی ہے۔ تا

ہم ان جانوروں کے پھیپھڑے اس طرح تخلیق کیے جاتے ہیں کہ ایسی بلندیوں پر موجود آکسیجن سے فائدہ اٹھاسکیں۔ان کے پھیپھڑے جو دوسرے دودھیلے جانوروں سے مختلف ہوتے ہیں ان کو ہوا کی کمی میں بھی توانائی کی بلند سطح برقرار رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔

ایک عمدہ حس سماعت

ترکِ وطن کے دوران پرندے فضائی مظاہر قدرت کا بھی خیال رکھتے ہیں۔مثال کے طور پر طوفان سے بچنے کے لیے وہ اپنی سمت بدل لیتے ہیں۔ایک ماہر طیور Melvin L.Kreithen جس نے پرندوں کی حس سماعت پر تحقیق کی،اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ کچھ

پرندے بہت کم سطح کی وقوع پذیر ہونے والی آوازیں سن لیتے ہیں جو کرۂ ہوائی میں طویل فاصلوں تک منتشر ہو جاتی ہیں۔ایک نقل مکانی کرنے والا پرندہ دور کسی پہاڑ پر برپا ہونے والے طوفان اور بہت آگے سیکڑوں کلو میٹر کے فاصلے پر سمندر میں پیدا ہونے والی گرج سن لیتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان علاقوں میں جہاں ہوائی حالات خطرناک ہوں پرندے بڑی احتیاط سے نقل مکانی کے راستوں کا تعین کر لیتے ہیں۔

سمت کا ادراک

پرندے ہزاروں کلومیٹر کی طویل پروازوں کے دوران ایک نقشے،قطب نما یا ایسے ہی کسی دوسرے آلے کے بغیر اپنی سمت کیسے تلاش کر لیتے ہیں؟

پہلا نظریہ جو اس بارے میں پیش کیا گیا یہ تھا کہ پرندے اپنی نیچے کی زمین کی خصوصیات یاد کر لیتے ہیں۔اور یوں بغیر کسی پریشانی کے اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔مگر تجربات سے ثابت ہوا کہ یہ نظریہ غلط ہے۔

ایک ایسے تجربے میں جہاں کبوتروں کو شامل تجربہ کیا گیا تھا،کبوتروں کی نظروں میں دھندلاہٹ پیدا کرنے کے لیے غیر شفاف عدسے استعمال کیے گئے تھے۔یوں ان کو زمینی نشانات سے شناسا ہوئے بغیر اڑنے کا موقع فراہم کیا گیا تھا۔مگر یہ کبوتر اس صورت حال میں بھی اپنے غولوں سے کچھ کلومیٹر پیچھے رہ جانے کے باوجود اپنی سمت تلاش کر لیتے تھے۔

حال ہی میں کی گئی ایک تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ کرۂ ارضی کا مقناطیسی میدان پرندوں کی

انواع (Species) پر اثر کرتا ہے۔کئی ایک تحقیقی مطالعات سے پتہ چلا ہے کہ پرندوں نے بڑی ترقی کرلی ہے،مقناطیسی برقی آنکھیں زمین کے مقناطیسی میدان سے فائدہ اٹھا کر اپنا راستہ تلاش کرنے میں ان کی مدد کرتی ہیں۔نقل مکانی کے دوران یہ نظام پرندوں کی مدد کرتا ہے کہ وہ زمین کے مقناطیسی میدان میں تبدیلی کو محسوس کر کے اپنی سمت کا تعین کرلیں۔تجربات سے پتہ چلا ہے کہ اگر زمین کے مقناطیسی میدان میں فی صد فرق بھی ہو تو نقل مکانی کرنے والے پرندے اس کا بھی ادراک کر لیتے ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان پرندوں کے جسموں میں قطب نما لگا ہوتا ہے۔مگر اصل سوال پھر بھی یہی سامنے آتا ہے کہ پرندوں میں اس قسم کا'' قدرتی قطب نما'' کیسے فٹ ہوگیا۔ہم جانتے ہیں کہ قطب نما ایک ایجاد ہے جو انسانی عقل وشعور کا کارنامہ ہے۔تو پھر ایک انسانی ایجاد جو اس نے اپنے مجموعی علم سے بنائی پرندوں کے جسم میں کیسے پہنچ گئی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کچھ برس پہلے پرندوں کی ایک نوع نے سمت کی تلاش کے دوران زمین کے مقناطیسی میدان کو استعمال کرنے کے بارے میں سوچا ہوگا۔اور اپنے جسم کے لیے اس نے ایک مقناطیسی آنکھ ایجاد کرلی ہوگی۔یا پھر کیا اس کے برعکس ایسا ہوا ہوگا کہ پرندوں کی ایک نوع،برسوں پہلے ''انطباق''(یعنی اتفاق) سے اس قسم کے میکانی عمل سے لیس ہوگی؟ یقیناً نہیں....نہ تو پرندہ نہ ہی انطباق (Coincidence) جسم میں نہایت جدید قطب نما لگا سکتا تھا۔پرندے کے جسم کی ساخت،پھیپھڑے،پنکھ،نظام ہضم اور سمت تلاش کرنے کی اس کی صلاحیت،سبھی اللہ کی جامع و بے نقص تخلیق کی مثالیں ہیں:

(اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ ط کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ ط وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِمَا یَفْعَلُوْنَ)

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ پرندے جو پر پھیلائے اڑ رہے ہیں؟ ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے اور یہ سب جو کچھ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔(7)

چنانچہ ماہرین طیور کی تحقیق نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو برحق ثابت کر دیا ہے کہ پرندوں کے اندر عقل مند لوگوں کے غور وفکر کے لیے بڑی نشانیاں ہیں کہ جو ان کو کائنات کے خالق کی طرف جانے والے راستے کی طرف گامزن کر سکتی ہیں۔(8)

حواشی

ارض ہند میں حمد و نعت کا اولین معیاری ادبی کتابی سلسلہ

جہانِ نعت

تقدیسی شاعری میں نعت وہ محترم صنف ہے جسے عشقِ الٰہی کا مظہر اور حبِ رسول کا اشاریہ بھی کہا جاتا ہے اور حصولِ حسنات کا ایک موثر وسیلہ بھی۔ ابھی چند برسوں پہلے کی بات ہے جب کچھ ناعاقبت اندیش ناقدین اسے مذہبی شاعری کے زمرے میں رکھ کر اس کی حیثیت بطور صنف تسلیم نہیں کرتے تھے۔ مگر اب وہ بات نہیں رہی۔ ان کے موقف میں نہ صرف تبدیلی آئی ہے اور حمدیہ و نعتیہ شاعری کو نہ صرف بطورِ صنفِ سخن تسلیم کیا جانے لگا ہے بلکہ ادبِ عالیہ میں بھی اس کا شمار ہونے لگا ہے۔ ہندوستان میں اس سلسلے کی اولین کڑی جہانِ نعت ہے۔ جس کا آٹھواں کا شمارہ بہت جلد آپ کے میز کی زینت بننے واا ہے۔ مختصر سی مدت میں ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ دراصل ہماری زندگی کا مقصد ہی ادبِ نعتِ مصطفیٰ ﷺ کا فروغ ہے۔ بیشتر اربابِ قلم و ناقدین فن کی نظروں سے گزر چکا ہے اور سبھوں نے اس کی خدمات کا اعتراف واشگاف لفظوں میں کیا ہے:

☆ جہانِ نعت کام مبارک آغاز ہوا ہے۔ پہلا مجلہ پڑھنے کا موقعہ ملا۔ آپ نے جس طرح یہ پاکیزہ مجلہ شروع کیا ہے اس کو برقرار رکھئے بلکہ اس میں مزید اضافے (خوشگوار) اس کی اہمیت اور مقبولیت میں اضافہ کریں گے۔ آپ کا جہانِ نعت پڑھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ (ابرار کرتپوری بانی حمد و نعت اکیڈمی دہلی)

☆ ا جہانِ نعت'' اُردو نعتیہ ادب کی خدمات فریضہ بحسن و خوبی انجام دے رہا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ کریم اس کتابی سلسلے کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین (طاہر سلطانی مدیر جہان حمد کراچی)

☆ جہانِ نعت ہندوستان سے نعتیہ ادب کا پہلا جریدہ ہے۔ جو رفتہ رفتہ ایک وسیع حلقے میں اپنی مقبولیت کا پرچم لہرا رہا ہے۔ اس رسالے کو ہر نعت پسند اور اہل ایمان کو ضرور پڑھنا چاہیے۔ اس میں شامل نعتیہ ادب کے حوالے سے نئے آفاق سے ہم رشتہ مضامین کی مدد سے ہمارے علم میں اضافہ ہوگا۔ اس کی خدمات یقینا قابل ستائش ہے۔ ایک ایسے علاقے سے آپ اس رسالے کو نکال رہے ہیں جہاں اردو کا دیگر شہروں کی بہ نسبت کم ہی بول بالا ہے۔ واقعی آپ ایک قابل تقلید کارنامہ انجام دے رہے ہیں (ڈاکٹر مشاہد رضوی)

مرتب: غلام ربانی فدا

www.jahanenaat.yoalsite.com
Mobile:009741277047

نوٹ: شعرا و ادبا سے گزارش ہے کہ اپنی نعتیہ ادبی مضامین ہمیں ارسال فرمائیں۔